اولڈ بوائے

اُولڈ بُوائے

علیگڈھ اُولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی اور تعلیمی ماہ نامہ

فہرستِ مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۲۷ء

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲۰۲ سلطان پورہ حیدر آباد دکن سے شائع کیا

قیمت سالانہ ۵ر — قیمت فی پرچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد (۱) اردوئے باب ماکتوبر نمبر

توارد معنوی

از جناب قاضی تلمذ حسین صاحب

دو مہینے ہوئے کہ "نگار" میں ایک مضمون حافظ اور ابن یمین کے متعلق چھپا تھا۔ اسے پڑھ ان لوگوں کو دلی صدمہ ہوا ہوگا، جو حافظ کے گرویدہ اور ثنا خواں ہیں، اور انہیں میں یہ ہیچمیرز بھی ہے؛ اس تاسف کا باعث یہ نہیں ہے کہ مضمون نگار نے حافظ اور ابن یمین کی غزلوں کا مقابلہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ حافظ کا ماخوذ منہ ابن یمین کا دیوان ہے، بلکہ وجہ افسوس یہ ہے کہ حافظ پر علانیہ "سرقہ" کا الزام لگایا گیا ہے، اور پھر یہ نہیں کہ دو چار شعر کا سرقہ کرلیا ہو۔ بلکہ اس مضمون کا لب لباب ہی یہ ہے کہ حافظ نے ابن یمین کا دیوان غایب کرلیا، اور اسی میں کچھ رد و بدل کرکے اسے اپنا بنا لیا، اور (صاحب مضمون کے نزدیک) ابن یمین کے دیوان کے مشہور نہونے بلکہ تقریباً مفقود ہو جانے کا سبب یہی ہے۔

ابن یمین کے ایسے مشہور و معروف شخص کے پورے دیوان کا استتار و انتساب (یعنی اسے اڑا لینا اور اپنا بنا لینا) تو بڑی بات ہے، شعرا ایک شعر کا بھی اپنی ملک سے نکل جانا کسی ملک کے نکل جانے سے کم نہیں سمجھتے۔ اسی باب میں ایک دلچسپ واقعہ قابل بیان ہے: قم میں دو شاعر

ملک تخلص کرتے تھے۔ ان میں سے ایک میرزا ملک قمی ہندوستان آگیا، دوسرے شاعر ملک طیفور کے ایک شعر کی نسبت قم میں یہ چرچا ہوا کہ یہ شعر میرزا ملک کا ہے۔ طیفور نے خاص اسی غرض کے لئے ایک قاصد ہندوستان بھیجا، اور میرزا ملک سے سند حاصل کرکے لوگوں کو ساکت کر دیا، شعر بھی لاجواب ہے۔

خونچکانست ملک تیغ ستم پیشہ ٔ یم
کہ پئے آغوش بدرقہ ٔ قاتل برود،

جب ایک شعر کی نسبت یہ انہماک و اہتمام ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ ابن یمین کا دیوان ان کی زندگی ہی میں غائب کر لیا گیا ہو، اور انہوں نے اس کی تلافی کی سعی نہ کی ہو۔ بہرحال، مضمون نگار کے اصول موضوعہ کو قبول کرنا، اگرچہ عقلاً و نقلاً دونوں طرح بعید از قیاس و خلاف واقعہ ہے، مگر اسے رد کرنے کے لئے بھی طولانی بحث کی ضرورت ہے، اور میں اپنی حالت کے اعتبار سے اس بحث میں نہیں پڑھنا چاہتا! بلکہ میں اصل مقصود توارد لفظی و معنوی پر ایک دوسری ہی نوعیت سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

شاعری کی تاریخ، ایسے اتفاقات سے خالی نہیں ہے، کہ دو شاعروں کے یکساں جذبات تقریباً یا کلیتہً "ایک ہی سے الفاظ میں ادا ہوئے ہوں۔ حال میں عبد العلی صاحب شوق (سندیلوی) نے ایک کتاب "اصلاح سخن" کے نام سے شائع کی ہے۔ اتحاد لفظی کا لطف اٹھانا ہو تو اسے دیکھئے۔ متعدد مصرعے ایسے ہیں، کہ مختلف شعرا نے ان پر اصلاح کا قلم چلایا ہے، اور اصل مصرعے کو کاٹ کر، ان کے بجائے، اپنی طرف سے دوسرے مصرعے لکھے ہیں اور چونکہ ردیف و قافیہ کو قائم رکھنا لازمی تھا اس لئے اکثر یہ اصلاحی مصرعے متحد الالفاظ ہو گئے ہیں۔ مگر اتحاد الفاظ کے سوا ایک اور شے توارد معنوی بھی ہے اور مجھے اس توارد معنوی سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں میں نے عربی، فارسی اور اردو کے ایسے اشعار کی ایک کافی تعداد "تلمیحین" میں شائع کی تھی، جو بالکل ہم معنی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ وہ "سرقہ" نہیں ہیں۔ اشعار کے مقابلہ کا عام و مقبول طریقہ اتحاد ردیف و قافیہ کے ساتھ ہے۔ مگر مجھے خاص

اتحادِ خیال میں ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں زیادہ تر یہ دیکھا کرتا ہوں کہ کس طرح
کوئی "خیال" کسی شاعر کے ذہن میں آتا ہے، اور وہ اسے بلا تکلف نظم کرکے اپنے افکارِ ابکار
میں شامل کر لیتا ہے، اور یہ محسوس بھی نہیں کرتا "کاین عروس ہزار داماد است"۔ اس کے
بعد دوسری خلش میرے دل میں یہ پیدا ہوا کرتی ہے کہ ایک ہی خیال مختلف ماحول کے
زیر اثر کس طرح مختلف انداز میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

ان دونوں امور کو چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ میرے دوست سید فضل الحسن
حسرت موہانی کا ایک بے نظیر شعر ہے :۔

ایک ہی بار رہویں وجہ گرفتاریٔ دل — التفات اُس کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ اس شعر کے کہتے وقت کسی دوسرے ہم معنی شعر کا وہم و
گمان بھی حسرت کے ذہن میں تھا۔ مگر ایک فارسی شاعر سات سو برس قبل کہہ گیا ہے :۔

اول نظر اگرچہ سرسری بود — سرمایۂ اصل دلبری بود

فارسی کے شعر میں "سرسری" کے لفظ نے اُردو شعر کے مصرع ثانی کا پورا کام دیا ہے
بلکہ اس سے کچھ زائد کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، رشید لکھنوی نے ایک مطلع بڑی شان کا کہا تھا ؎

سئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے — چاک دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

لکھنؤ میں اس کی بڑی دھوم مچی۔ میرے مکرم حضرت ریاض نے اس پر مطلع کہا ؎

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے — شکل معشوق کی، انداز ہیں دیوانوں کے

اخباروں میں اس کا بہت چرچا ہوا، مطلع لاجواب قرار پایا، اور یہ مسلم ہو گیا کہ
"گل" میں ایک ساتھ "عاشق" "معشوق" کی شان کا جمع کر دینا بالکل نیا خیال ہے ؛
جسے آج تک کسی نے نظم نہیں کیا۔ مگر سنئے، اب کئی صدی قبل کا شعر :

گل را اگر ز لطف نسیم غار آمد — دل پارہ پارہ کردہ و دلدار آمد

کیا حضرت ریاض نے جس وقت مذکورہ بالا مطلع کہا تھا، ان کو اس فارسی شعر کا علم تھا؟

یں تیقن کے ساتھ کہتا ہوں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ حضرت ریاض کے ساتھ باوجود کمال عقیدت
میں اسقدر ظاہر کر دینے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ ریاض کے شعر نے اگرچہ دنیائے اردو کو
مسخر کرلیا مگر تشبیہ میں ایک تناقص رہ گیا۔ "گل" کی کامل تطبیق "عاشق چاکِ گریبان"
کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مصرع ثانی یہ چاہتا ہے کہ کوئی معشوق ہو اور کسی عاشق کا دھجیاں
اڑا ہوا پیرہن اس کے گلے میں ڈالدیا جائے۔ فارسی کے مصرع ثانی کا کمال یہی ہے،
کہ تضاد میں تطبیق پیدا کردی ہے۔

علیٰ ہذا داغ کا (یا شاید کسی اور کا) یہ شعر زبانزد ہے ؎

کوئی کھلتی نہیں نظر بازی　　نام اس کھیل کا ہے سربازی

حافظ مدتوں پہلے کہہ گئے ہیں ؎

عشقبازی کار بازی نیست اے دل سرباز　　ورنہ گوئے عشق نتواں زد بچوگان ہوس

اردو کے دونوں مصرعے فارسی کے صرف ایک مصرع اول میں آگئے ہیں، اور مصرع
ثانی میں جو تنبیہ لطیف بصورت توجیہ ہے اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ داغ نے
(یا جس کسی کا شعر ہو اس نے) حافظ کا یہ شعر ذہن میں محفوظ رکھکر کہا تھا۔ اس مقابلہ سے یہ بھی واضح
ہوتا ہے کہ ایک ہی تخیل اختلاف احوال کے لحاظ سے کس طرح مختلف ہیئت اختیار کرلیتا ہے۔
خیال ایک ہی ہے مگر اردو کا شعر بالکل عامیانہ ہے۔ حافظ نے مصرع ثانی کی گونہ پارسایانہ
تشویق و ترہیب سے علانیہ رندی پر پردہ ڈالنا چاہا ہے، دیکھئے کہ یہی خیال ایک صوفی
صافی کے دماغ میں پہنچکر کیا صورت اختیار کرلیتا ہے ؎

عشق از اول چرا خونی بود　　تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

اس شعر کی فلسفیت پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کس خوبی سے اصل حقیقت کو کھولدیا ہے۔
عشق کی یہ ساری خونریزی کھرے کھوٹے کے پرکھنے کیلئے ہیں، ورنہ اصلاً و واقعاً عشق خونی
نہیں ہے۔

غالب کا ایک نہایت ہی سرور افزا شعر ہے ؎

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ؎ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

نازک خیالی میں کوئی شک نہیں، مگر سوئے ظن نے ذرا کرکری کردی ہے۔ پینے سے قبل ہی بدگمانی ہوئی اور معلوم ہوتا ہے کہ نہیں پی۔ خمخانۂ فارس کے میکش کے وہاں اس بدگمانی کی گنجایش نہیں۔ بلا وسواس پی لی، اور پینے کے بعد کچھ محسوس ہوا۔ اسوقت عالم بیخودی میں مستانہ وار فرماتے ہیں:۔

در شراب ہم چیز دیگر ریختی، در ریختی ؎ بادہ تنہا نیست ایں آمیختی، آمیختی

اس تکرار قافیہ نے رندانہ عربدہ جوئی کا کچھ عجب نقشہ کھینچ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تہدید مستانہ سے بطور تاوان کچھ اور وصول کیا چاہتے ہیں۔[علہ]

غالب کا یہ شعر بھی ان کے منتخب اشعار میں ہے؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ؎ بادہ نوشی ہے، باد پیمائی

غالب نے یہ خیال پیدا کیا ہے کہ ہوائے خوش بھی تاثیر میں شراب سے کم نہیں ہے۔ اسمیں "باد" اور "بادہ" کے الفاظ نے جان ڈالدی ہے۔ مگر غالب سے چھ سو برس قبل مولانا رومیؒ اس خیال کو ایک حکایت کے ضمن میں اس سے زیادہ موثر پیرایہ میں ظاہر کر گئے ہیں زیادہ موثر اسوجہ سے کہ غالب نے خاص انہیں دو لفظوں کا جوڑ ملانے کے لئے شعر وضع کیا ہے، اور مولاناؒ نے امر واقع کے طور پر لکھا ہے۔ شعر یہ ہے؎

بوئے خوش را عاشقانہ میکشید ؎ جان او از باد، بادہ می چشید

علہ یہیں سے اختلاف امزاج کے اثرات کی ایک نہایت تاباں مثال ملاحظہ فرمائیے۔ کعبؓ بن زہیر نے اپنے شہرہ آفاق قصیدۂ "بانت سعاد" (معروف بہ قصیدۂ بردہ شریف) میں اس آمیزش کا ذکر کیا ہے، مگر متانت کی یا انتہا ہو کہ معلوم ہوتا ہے کسی معمل طبی میں آمیزش شراب کا کیمیائی و خواصی تجربہ کیا جا رہا ہے:۔

تجلو عوارض ذی ظلم اذا ابتسمت ؎ کانہ منہل بالراح معلول

شجت بذی شبم من ماء محنیۃ ؎ صاف بابطح اضحی وھو مشمول

مطلب۔ کہ شراب میں پانی اس انداز سے ملا ہے کہ رقیق تو ہو گیا ہے مگر قوت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی ہے، خود پانی کے حالات و خواص یہ ہیں کہ سرد ہو، پہلو کی موڑ سے لیا گیا ہو، صاف ہو، چوڑے چکلے نالے کا پانی ہو، سویرے ہی سویرے لیا گیا ہو، پھر باد شمالی

حریری نے بھی شراب کے متعلق ایک جگہ اسی قسم کی صنعت تجنیس سے کام لیا ہے۔ مگر اس نے راح (شراب) اور راح (کف دست) ایک ہی لفظ کو دو معنی میں استعمال کر کے اسے اور بھی کامل بنا دیا ہے:-

نهانی الشیب عما فیه افراحی ۔۔۔ فکیف اجمع بین الراح والراح

حافظ نے بھی یاد کو بادہ سے ربط دیا ہے اور "راح" کو "روح" سے پیوست کیا ہے، بلکہ "پیمان" و "پیمانہ" کا بھی جوڑ ملا دیا ہے:-

بادہ در دہ، چند ازیں باد غرور ۔۔۔ خاک بر سر نفس بد فرجام را

بیا کہ قصر عمل سخت سست بنیاد است ۔۔۔ بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است

بادۂ لعل لبش کز لب ما دور مباد ۔۔۔ راح روح کہ پیمان دہ و پیمانہ کیست

علیٰ ہذا روزے کے متعلق غالب کا ایک قطعہ بطور لطیفہ مشہور ہے:-

افطار صوم کی کچھ جسے دستگاہ ہو ۔۔۔ اس شخص کو ضرور ہے روزے رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ۔۔۔ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

فارسی شاعر مدتوں پہلے کہہ گیا ہے۔

آمد رمضان و نہ صاف داریم نہ دُرد ۔۔۔ وز چہرۂ من گرسنگی رنگ ببرد

در خانۂ ما خوردنی چیزے نیست ۔۔۔ اے روزہ برو، ورنہ ترا خواہم خورد

کیا غالب نے اس رباعی سے "روزہ کھانے" کا مضمون لیا ہے؟ یہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ اگرچہ مطلب ایک ہی ہے، مگر فارسی کی شان بڑھی ہوئی ہے؟ غالب نے عذر تقصیر کیا ہے، اور فارسی شاعر نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ روزے کو پہلے ہی دریدر کیا۔

لیکن مذکورۂ بالا ترجیحات سے اردو اشعار کی تعریف مقصود نہیں ہے۔ بسا اوقات اردو کے اشعار فارسی سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے:-

سر ز مستی برنگیرد تا بصبح روز حشر ۔۔۔ ہر کہ چوں من در ازل یک جرعہ خورد از جام او

اس میں اصل خیال "کیف شراب" سے حشر تک ہوش میں نہ آنے کا ہے۔ حافظ نے

اس مستی کا آغاز ازل سے کیا، صبح حشر تک کے لئے بیدار ہو گئے۔ ریاض نے اسے دوسرے جانب مثلاً شام حشر تک پہنچایا، اور حق یہ ہے کہ ریاض کے تخیل کو فوقیت ہے؛

پی لی تھی کچھ کہ چین سے گزرے شب لحد — دن ڈھل چکا ہے حشر کا ابتک خمار ہے

علی ہذا حافظ کا شعر ہے:

حافظ شراب و شاہد و رندی نہ وضع تست — فی الجملہ میکنی و فرو میگذارمت

ریاض نے اس تخیل (تضاد وضع ظاہری و شغل مخفی) کو اور پر لطف بنا دیا ہے:

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں یا ریش سفید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

خیام کی رباعی مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ رباعی ہے:

ہر سبزہ کہ برکنار جوے رستہ است — گویا زلب فرشتہ خوے رستہ است

پا بر سر سبزہ ہا بخواری ننہی — کان سبزہ زخاک لالہ روے رستہ است

مگر انصاف یہ ہے کہ غالب نے ایک شعر میں اس مطلب کو اس سے بہتر ادا کر دیا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اب میں دو تین مثالیں فارسی ہی کی دیتا ہوں جس میں ایک ہی مضمون کو تقریباً ایک ہی سی شان کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ حافظ کا شعر ہے:

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من — کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

محمد شیریں مشہور بہ مغربی اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

چشم اگر اینست و ابرو این و ناز و عشوہ این — الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دین[علہ]

شعر ذیل ضرب المثل کی حد تک پہنچا ہوا ہے:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

علہ اردو کے شاعر نے اس تعمیم میں تخصیص کر کے ایک عجیب منظر پیش نظر کر دیا ہے، کہ در گفتن نمی آید۔

جب ہاتھ میں ساقی کے گلابی ہوگی — اور چشم سیہ مست شرابی ہوگی

تب عقل و خرد پہ کیا بلا آئیگی — اور ہوش کے سر پہ کیا خرابی ہوگی

اس کے جواب میں ایک دوسرا شعر بھی موجود ہے:

جمالِ شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال — ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداریست

معشوق کے تنہا سیر باغ کے جانے کی شکایت شیخ سعدیؒ اور مولانا رومیؒ دونوں کو ہی اور دونوں نے نہایت پر لطف طور پر اس کا اظہار کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کے شعر کی لطافت بڑھی ہوئی ہے:

سرو سیمینا بصحرا میروی — نیک بے مہری کہ بے ما میروی (سعدیؒ)

باز چوں گل سوے گلشن میروی — با توام گرچہ تو بے من میروی (رومیؒ)

توارد معنوی کی ان چند مثالوں کے بعد اب مجرد اتحاد خیال کی دو ایک مثالیں اس اعتبار سے عرض کرتا ہوں کہ ایک ہی خیال ماحول کے اثر سے کس طرح مختلف قالب اختیار کرلیتا ہے:

"تعارف ذات" ایک بہت ہی عام خیال ہے کہ شاعر کسی نہج سے خود اپنا تعارف کرادے فخریہ اشعار اور "در مدح خود میگوید" کی بنا یہی ہے اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ مگر اردو میں حضرت میر تقی میر نور اللہ مرقدہٗ کا ایک شعر ہے، جو آپ اپنا نظیر ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے[1]

شعر کی لطافت و نزاکت اور پھر حسرت و یاس کے شمول سے قلب پر ایک عجب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ مگر بایں ہمہ، شعر کے لفظ لفظ سے عجز و مسکینی، تذلل و عدم اعتماد نفس کا اظہار ہو رہا ہے۔ کسی موقع پر متنبی کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنا تعارف کرائے، اور اس نے بھی ایسے ہی متعدد شواہد سے اپنا تعارف کرایا ہے۔ مگر فرق ملاحظہ ہو:

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی — والضرب والطعن والقرطاس والقلم

---

[1] بھائی منظر اشہر نے بھی اس مضمون کا ایک شعر خوب نکالا ہے ؎

گل نہ جانے ہاتھ کانوں پر رکھے غنچہ مگر

باغباں واقف تو ہے، مجھ سے مری آواز سے

(گھوڑے مجھے جانتے ہیں راتیں مجھے جانتی ہیں، بے آب وگیاہ میدان مجھے جانتے ہیں، قرب شمشیر وسناں مجھے جانتی ہے، اور کاغذ وقلم بھی۔) ترجمہ میں اصل کا لطف کسی طرح سے پیدا نہیں ہو سکتا پھر بھی امتیاز ظاہر و باہر ہے۔ یہاں گل ہے نہ بوٹا، گھوڑا ہے نہ میدان، تلوار ہے اور نیزہ، اور پھر کاغذ بھی ہے اور قلم بھی! یعنی شاعر صاحب القلم ہونے کے ساتھ ہی صاحب السیف بھی ہے۔

اس شعر کے نقل کرنے کے بعد اسکا واقعہ متعلقہ نہ بیان کرنا جان شاعری پر ستم کرنا ہے۔ سیف الدولہ نے ایک مرتبہ کسی دوسرے شاعر کو متنبی پر ترجیح دی۔ متنبی نے ایک عتابیہ قصیدہ لکھا اور لکھکر فردوسی کیطرح بھاگا نہیں، بلکہ سیف الدولہ کو سنا بھی دیا۔ اسی قصیدے میں یہ فخریہ شعر بھی ہے موت کیلئے حیلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، یہی شعر متنبی کی جان لینے کا سبب ہوا۔ متنبی آخر آخر سیف الدولہ سے ناخوش ہوکر مصر کو چلا گیا، وہاں کافور اخشیدی کی مدح کرتا رہا۔ اس سے بھی موافقت نہ ہو سکی تو فارس میں عضد الدولہ کے پاس گیا؛ وہاں بھی نہ بنی تو کوفہ کو چلا۔ راستہ میں فاتک اسدی نے اُسے گھیر لیا؛ کیونکہ متنبی نے اسکے قبیلے کی ہجو کی تھی معمولی مقابلہ کے بعد متنبی نے بھاگنا چاہا، غلام نے کہا کہ کیا آپ نے یہ شعر نہیں کہا ہے: والخیل واللیل ...... یہ سنتے ہی متنبی جوش میں آکر پلٹ پڑا اور لڑتے لڑتے جان دیدی۔ مشرق ومغرب کا تمام دفتر نظم اسکی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کر سکتا کہ کسی شاعر نے اپنے شعر پر جان دیدی ہو۔

افسانہ از افسانہ میخیزد۔ متنبی کے سوا کسی شاعر نے اپنے شعر کی آن قایم رکھنے کیلئے تو جان نہیں دی ہے، مگر عالم خیال میں وہ ہر ساعت، ہر لحظہ جان دیتے رہتے ہیں۔ اِس جان دینے کی صورتیں ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں؛ از انجملہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اپنے کو شمشیر ناز کے نذر کردیں۔ اسکی بھی تشبیہیں و تمثیلیں بیشمار ہیں، از انجملہ ایک یہ ہے کہ "تلوار کا بوسہ لیلیا" یہی تصور دو شاعروں کے ذہن میں آتا ہے، مگر دیکھئے کہ اپنی اپنی حالت کے اعتبار سے دونوں کس طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اردو کا شاعر (داغ ؟) کہتا ہے:-

تمھاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ　　کبھی کسی سے نہ ہم دبکے بانکپن یہ ہے

شعر کے "بانکپن" میں کوئی کلام نہیں۔ شاعر نے بہت ہمت دکھائی ہے، مگر آخر ہر پھر کے دائرہ کے اندر ہی رہے

عربی کا شعر ہے (شاعر کا نام اسوقت یاد نہیں آتا) ؎

ذکرتك والرماح نواهل منی   وبیض الهند تقطر من دمی

فوددت تقبیل السیوف لانها   لمعت کبارق ثغرك المتبسم

میں نے تجھے اسوقت یاد کیا جب نیزے میرے جسم میں پیوست ہو رہے تھے، اور ہندی تلواروں سے میرا خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے جو اسی شوق سے تلواروں کا بوسہ لیا وہ اس وجہ سے تھا کہ اسکی چمک نے تیرے تبسم دنداں کی چمک کو یاد دلایا تھا۔

خدارا، ذرا آنکھ بند کرکے یہ تصور ذہن میں پیدا کیجیے کہ معرکہ کارزار گرم ہے نیزے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں، تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، اور عاشق ہے کہ بڑھ بڑھکر تلواروں کا بوسہ لے رہا ہے؛ صرف اس وجہ سے کہ تلوار کی چمک کسی کے دانتوں کی چمک کو یاد دلاتی ہے۔

یہ دونوں مثالیں شور انگیز مثالیں ہیں۔ اب ایک پرسکون مثال بھی ملاحظہ ہو

شیخ کے خضاب پر بہتان اڑانا تو بہت عام ہے۔ سیکڑوں شعر موجود ہیں، مگر اہنیں میں فلسفہ خضاب، پر صائب کا ایک باتمکین شعر ہے!

خضاب پردۂ پیری نمی شود صائب   بمکر وحیلہ خزاں را بہار نتواں کرد

صائب تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ایک بے نظیر مثال دی ہے، مگر ابوالحسن علی بن عباس (المتوفی ۲۸۳ھ) اس مفہوم کو نہایت منطقیانہ و فلسفیانہ طرز پر صائب سے سیکڑوں برس پہلے سمجھا گئے ہیں:۔

اذا دام للمرء الشباب ولخلقت   محاسنه ظن السواد خضابا

فکیف یظن الشیخ ان خضابه   یخال سوادا او یظن شبابا

جب شباب زیادہ دنوں رہے تو دیرینہ ڈاڑھی کی اصلی سیاہی خضاب معلوم ہونے لگتی ہے: پس "شیخ" (بڈھا) یہ کیونکر خیال کر سکتا ہے کہ اسکے خضاب کو کوئی اصلی سیاہی سمجھے گا یا اسپر شباب کا گمان ہوگا

اردو کا بھی ایک شعر تقریباً اسی مفہوم کا ذہن میں ہے، مگر وہ ان پاکیزہ اشعار کیساتھ نہیں کہا جا سکتا،

سن لینے میں البتہ کوئی جرم نہیں ہے۔

باقی ہے دل میں شیخ کے الفت شباب کی　　　کالا کریگا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

یہ چند مثالیں منفرد اشعار میں تو اردو مثنوی کی پیش کیگئی ہیں، لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی سے خیال کو مختلف شعرا نے پھیلا کر بیان کیا ہو؟ اسمیں اتحاد کلی نہیں پیدا ہو سکتا، صرف مضمون واحد ہوتا ہے۔ مگر اس سے شاعر کے خصوصیات اور باہمی وجوہ ترجیح بہت واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

شرف الدین شفروہ ساتویں صدی کے شعرا میں ہیں۔ ان کی ایک غزل "تاریخ گزیدہ" (حمد اللہ المستوفی) میں منقول ہے۔ شعرا کی ایلچی گری "صبا" کی پرانی خدمت ہے، اور یہ بھی اپنے اولے فرض میں نہایت چست و مستعد ہے۔ مگر شعرا نے اس سے کام لینے میں بجری تار برقی کے کوڈ کیطرح ہمیشہ اختصار رمزی مد نظر رکھا ہے۔ شفروہ نے اسکی پروا نہیں کی اور "صبا" کو "قاصد" نہیں بلکہ "مختار عام" بنا دیا ہے[1] ملاحظہ ہو "مختار نامہ":

گر توانی اے صبا کن بگذرے بر کوی او　　　گر دلت خواہد بر از من سلامے سوی او

آن زمان کانجا رسی آہستہ باش و دم مزن　　　تا نشورد خواب خوش بر نرگس جادوی او

حلقہ زلفش مجنبان جز بانگشت ادب　　　ہاں وہاں تا ترکی مکن با طرہ ہندوی او

نرم نرم آن برقعہ مشکین بر انداز از رخش　　　ور گمان بد نداری بوسہ زن بر روی او

نے غلط گفتم من این طاقت ندارم زینہار　　　گر رسول خاص باشی تیز منگر سوی او

گر دلم بینی در انجا گو حرامت باد وصل　　　من چنین محروم تو پیوستہ ہم زانوی او

شفروہ نے پھر بھی چھ شعروں تک بس کیا ہے۔ شیخ فخر الدین عراقی کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے۔ انہوں نے بھی اسی نوع کی ایک غزل لکھی ہے، اور "صبا" کو پورا "اٹارنی جنرل" "کمیشن" دیدیا ہے:

اے باد "بروِ" اگر توانی　　　بر خیز مسیک مکن گرانی

---

[1] سیف اسفرنگی کا دل بھی انہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ انہوں نے بھی "صبا" کے ذریعہ سے کچھ کہلایا ہے۔ مگر خود دل وہاں کسی حال میں تھا اسکی نسبت شفروہ اور اسفرنگی کے خیالات ایک دوسرے کی ضد ہیں:-

اے باد صبا مرا بکلبہ برسان　　　وز من بنگارِ من پیامے برسان

در طُرّہ او دلیست مارا زنہار　　　گر زندہ بیابی پیش سلامے برسان

بگذر سحرے بکوئے جانان — دریاب حیات جاودانی

بارے تو نہ چو من مقید — از وے بچہ عذر باز مانی

خاک درِ او ببوس ہلا مباش — خدمت برساں چنانکہ دانی

اس کے بعد پورے بائیس (۲۲) شعروں کا "ہدایت نامہ" صبا کو عطا کیا ہے۔ بخوف طوالت اس کے نقل کرنے سے معذوری ہے۔ ان دونوں شعرا کے بعد آٹھویں صدی میں حافظ کا زمانہ آیا، وہ کب پیام سلام سے باز رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی اسی "صبا" سے کام لیا ہے، مگر تین شعروں میں کل معاملہ ختم کر دیا ہے۔

اے صبا گر بگذری بر ساحل رودِ ارس — بوسہ زن بر خاک آن وادی و مشکین کن نفس

منزل سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام — پر صدائے ساربان بینی و آہنگ جرس

محمل جاناں ببوس آنگہ بزاری عرضہ دار — کز فراقت سوختم اے مہرباں فریاد رس

حافظ کے ان تین شعروں میں جیسی کچھ لطافت اور نزاکت اور جامعیت ہے ان سے لطف اندوز ہونا تو ذوق سلیم پر منحصر ہے، مگر جن ظاہری اسباب سے یہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں ان میں بعض یہ ہیں: (۱) شفروہ اور عراقی دونوں نے "صبا" کیلئے "توانی" کی شرط لگائی ہے، جس سے عزمیت کے بجائے تشکیک پیدا ہو جاتی ہے۔ حافظ نے اس امکان و عدم امکان کے تصور کو یکقلم اڑا دیا ہے۔

(۲) اول الذکر دونوں شاعروں نے "کوئے جاناں" کو مقام معلومہ قرار دے لیا ہے۔ حافظ نے یہاں بھی غیرت کو نہیں چھوڑا اور خاص اسی میں دشواری حائل کر دی ہے۔

(۳) دوسروں نے سلام کو صبا کے پہنچنے پر منحصر رکھا ہے، حافظ کو یہ گوارا نہیں سلام تو ہر آن، ہر ساعت پہنچتا رہتا ہے، البتہ کچھ پیغام خاص ہے، جسے صبا کے ذریعہ پہنچایا ہے۔ بہر حال میری رائے ناقص میں محاکمہ کیلئے متحد الاوزان والقوافی غزلوں کے بجائے متحد المعانی غزلیں زیادہ موزوں ہیں مگر یہ کام نسبتاً وقت طلب ہے۔

قصہ کو آخر تک کیوں نہ پہنچا دیا جائے؟ کوئی ایسا بھی خوش نصیب گزرا ہے کہ اس کا

پیغام لیکر صبا گئی ہے اور واپس آئی ہے اور حسن کا ظن، یقین کے حد کو پہنچ گیا ہے کہ ضرور ادھر سے بھی کوئی جواب لائی ہے۔ اب ذرا اسوقت کی بیقراری کو ملاحظہ فرمائیے:

اے صبا، ہلنے کہ داری در سر یار بگو | ورنہ گوئی ہا کسے، از ما شقان یار بگو
قصہ کن در گوش ما، گر دیگراں نامحرمند | تا دل پر خون ما، پیغام دلدارے بگو (مولانا روم)

اس جملہ معترضہ کے بعد اس اتحاد خیال کی مثال میں ایک اور غزل پیش کرتا ہوں مگر ان دونوں غزلوں کی یکسانیت پر حاوی ہونے کیلئے پرواز خیال کو ذرا بلند کرنا پڑیگا۔ خدا کی ہستی کے دلایل میں سب سے قوی دلیل خود موجودات عالم ہیں۔ مگر مختلف دماغوں میں اس کا تصور مختلف حیثیت سے آتا ہے۔ ایک جاہل کے ذہن میں بھی کسی ایک وقت ہیبت افزا خیال پیدا ہو جاتا ہے، جسے قبول کرنے کیلئے صغریٰ کبریٰ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک فلسفی کے دماغ میں بھی یہ خیال زور کرتا ہے، مگر وہاں دلائل اور دلیل کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ شاعر پر بھی کسی وقت اس سے ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ ہمہ تن حیرت بنکر ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کوئی کیفیت کسی وقت غالب کے دل میں پیدا ہوئی اور مولانا روم پر بھی کسی وقت یہ وجد طاری ہوا۔ دونوں نے سوالیہ انداز میں اپنے جذبات دلی کا اظہار کیا ہے، اتحاد خیال کے اصول کو ذہن میں جاکر دونوں اشعار پر نظر کریں کہ کیونکر ایک ہی سے واردات دونوں کے قلب کو بیچین کئے دیتے ہیں، مگر اتنا ملحوظ رہے کہ

شعر غالب نیتجۂ ماسیتست | شعر رومی زحیرت وسیتست

غالب نے سوالات خود اشیا پر وارد کئے ہیں، مولانا نے قدم آگے بڑھایا ہے، راز کو ذرا زیادہ کھول دیا ہے اور سوالات "شخص" پر عاید کئے ہیں؛ یعنی غالب کے یہاں "چیست" ہے، مولانا کے یہاں "کیست"۔

غالب

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ | آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود | پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

مولانا رحمہ

در چہرۂ دلبراں عیاں کیست؟ در کسوتِ این و آں نہاں کیست؟
آنکس کہ بنور خود برافروخت در خلوتِ جسم شمعِ جاں کیست؟
آنکس کہ بگرد ماہِ رخسار خطے بکشید از جہاں کیست؟
آنکس کہ زعکس عارضِ اوست لطفِ گل حسن ارغواں کیست؟
گفتی کہ نہانم از نظرہا ظاہر بظہور این و آں کیست؟
آں چہرۂ مہوشانِ دلکش پیداست بہ بیں کہ دلستاں کیست؟

مولانا کی غزل تیرہ شعروں کی ہے، اور سب شعر اسی انداز میں ہیں۔ غالب کی غزل گیارہ شعروں کی ہے، مگر اسمیں چھ شعر دوسرے انداز میں ہیں، اسلئے انہیں حذف کردیا ہے، اور مولانا رحمہ کی غزل سے چھ شعر جو زیادہ قریب المعانی تھے، لے لئے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو ان غزلوں میں اتحاد خیال کے قبول کرنے میں تامل ہو، اور سطحی طور پر نظر میں واقعی ایسا ہی معلوم ہوگا، مگر اصل یہ ہے کہ اتحاد خیال کا بھی شجرۂ نسب ہے۔ خاندان کے کل ارکان شجرہ کی ایک ہی شاخ میں متحد نہیں ہوجاتے اسیطرح خیالات کا اتحاد بھی ایک ہی زینہ پر نہیں ہوجاتا، کہیں کہیں دو دو تین تین زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ معانی کا حال بھی الفاظ ہی کا ایسا ہے کہ بعض الفاظ کی اصل تک پہنچنے میں تین تین چار چار واسطے طے کرنا پڑتے ہیں[1]۔ میری خود تو یہ کیفیت ہے کہ مجھے اشعار ذیل میں بھی "اتحاد کامل" نظر آتا ہے:۔

انکی نظروں کو کوئی کہتا نہیں دل ہمارا مفت میں بدنام ہے

---

[1] اگرچہ بے محل ہے مگر میں اس کی مثال میں خود اپنی ایک واردات کا درج کردینا چنداں ناموزوں نہیں سمجھتا، خلجہ ... باقی صفحہ (۱۱۲)

پرسم ز تو پرسیدن اگر عیب نباشد — عاشق چو نمی خواہی معشوق چرائی (خواجو)

ضروب الناس عشاق ضروبا — فاعذرہم اشفھم حبیبا (متنبی)

حاصل ان تینوں شعروں کا یہی ہے کہ عشق کے برانگیختہ ہونے کا باعث خود حسن ہے، ورنہ عشق کی بجائے خود کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس سارے فلسفۂ حسن و عشق کو صاف لفظوں میں یوں کہدیا ہے:۔

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جو — تا نہ معشوقش بود جویائے او (مولانا روم)

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۶)) کیونکہ یہ رسالہ پبلک کیلئے تو ہے نہیں، اس کے مخاطب تو صرف "برادران مدرسۃ العلوم" ہیں، اور انمیں سے جو مجھے جانتے ہیں وہ مجھے ہمیشہ ہی سے کسی قدر بے تکا ہی سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں شروع شروع میں دارالترجمہ میں آیا تھا تو میں نے بشپ (Bishop) کا ترجمہ "اسقف" کردیا، اور یہی ترجمہ چھپ گیا بعد میں اس پر اعتراض ہوا، اور معاملہ بورڈ میں پیش ہوا۔ میں نے یہ ترجمہ صرف اسوجہ سے کردیا تھا کہ عربی میں "اسقف" کا لفظ پڑھا تھا۔ اسے "بشپ" کا مرادف سمجھ لیا، خصوصیت کے ساتھ تحقیق نہیں کیا۔ بورڈ میں جب بحث چھڑی تو شہادت کیلئے دو گواہان عادل و تیسرٹ اور بیجر کی طلبی ہوئی بیجر نے تو صرف اتنی ہی شہادت دی کہ عربی میں "بشپ" کے لئے "اسقف" استعمال ہوتا ہے۔ مگر ویبسٹر نے اپنے بیان سے سب کو حیرت میں ڈال دیا کہ "بشپ" اور "اسقف" ایک ہی لفظ کے دو تلفظ ہیں:۔ انگریزی Bishop از اینگلو سیکسن Biscop از یونانی Episcopos بمعنی بالا اور Skopeo بمعنی نگریستن" "اسقف" معرب Skopeo. پس بشپ کے معنی ہوئے از "بالا نگرندہ" یعنی نگرانی کرنے والا:)

اب ذرا خیال کو اور آگے بڑھایئے۔ یونانی لفظ Episkopos کا صحیح ترجمہ عربی میں "اشراف" ہے اور "مشرف" کا عہدہ حکومت ہائے اسلامی میں ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ اور تمام کتابوں میں مذکور ہے۔ سعدی نے بھی نظم کیا ہے:۔

چو مشرف دو دست از امانت بداشت — بباید بر و ناظرے بر گماشت

ورا نیز در ساخت پا خاطرش — ز مشرف عمل بر کن و ناظرش

اگر Episcopos کا بالکل لفظی ترجمہ انگریزی میں کیا جائے تو Overseer (اورسیر) ہے اور یہ عہدہ آب عام طور پر تعمیرات سے مخصوص ہے۔ الفاظ کی بھی خفیہ تاریخ اور ان کا باطنی مفہوم ہے، جس کی وجہ سے ہر لفظ کا ترجمہ کر دینا ممکن نہیں ہوتا؛ ورنہ "اسقف" کے بجائے عربی میں "مشرف" اور انگریزی میں "اورسیر" کرنا چاہئے تھا۔

حاصل کلام یہ کہ اس توارد معنوی کا میدان بہت وسیع ہے، رواج قدیم تو یہ ہی کہ شعرا کا مقابلہ "قافیہ بندی" کے لحاظ سے ہو یعنی کسی خاص قافیہ کو مختلف شعرا کس طرح باندھا ہے اسی کے لحاظ سے شعر کا درجہ قرار دیا جائے۔ اس میں اصل امر قافیہ ہوتا ہی، خیال اس کے تابع ہوتا ہے، یعنی میدان مسابقت شدید حد بندیوں سے گھرا ہوتا ہے۔ لیکن فی زماننا کہ قافیہ پیمائی کیطرف زیادہ التفات نہیں رہا ہے؛ بلکہ بعض جدت پسند طبائع نے ردیف و قافیہ کو سرے سے اڑا دیا ہے، مقابلہ اگر دلچسپ ہو سکتا ہے تو اتحادِ خیال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ میری اس نامربوط تحریر کا مقصود یہی ہے، کہ میں اپنے ان بھائیوں کو جو شعر و شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، اسطرف توجہ دلاؤں کہ اگر وہ متحد الخیال اشعار کو نوٹ کرتے ہیں اور گاہ بگاہ انہیں اپنے رسالہ (اولڈ بوائے) میں شائع کرتے ہیں تو کچھ دنوں بعد طبیہ کانفرنس کے مجربات صدری کی طرح ایک دلچسپ مجموعہ اس قسم کے اشعار کا مرتب ہو جائے گا جو سلسلہ ارتقائے تخیل میں شاعرانہ و فلسفیانہ دونوں طرح پر کارآمد ثابت ہوگا۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ۔ لا شئ محروم الفراغ

کلامِ ضامنؔ

از جناب مولوی سیّد محمد ضامن صاحب ضامنؔ کنتوری

(۱)

گرمیٔ نازِ حسن سے سوز نفس کہاں نہیں
شعلہ فروش بجلیاں دشمنِ خس کہاں نہیں

اک ہمیں لے کے آئے تھے ہمتِ بے نیازِ شوق
راہ نوردِ جستجو مور و مگس کہاں نہیں

میکدہ ہو کہ خانقاہ بادۂ عشق چھپ کے پی
رہزنِ عیشِ بے خلش بیمِ عسس کہاں نہیں

عالمِ مادّی میں ہے موجِ صدا کو مدّ و جزر
قافلہ گرم کوچ ہے بانگ جرس کہاں نہیں

دل میں تپاں ہے آرزو سینے میں دل ہے بیقرار
تن میں ہے دردمند روح قید قفس کہاں نہیں

بزمگہِ وجود میں ہے حرکت کا نام زیست
زخمہ خور امید و بیم تار نفس کہاں نہیں

ضامنِ عافیت طلب عرصۂ زندگی ہے یہ
دل کو سکوں کہیں نہیں شورِ ہوس کہاں نہیں

(۲)

شوقِ دل کا ہے تقاضا ترا جلوہ دیکھوں
آنکھ کہتی ہے کہ خیرہ ہے نظر کیسا دیکھوں

کیوں کروں دید کی خواہش نہیں جب طاقتِ دید
کچھ بصیرت ہے تو قدرت کا تماشا دیکھوں

خوابِ غفلت سے کھلے آنکھ تو ہنگامِ سحر
چشمۂ شرق سے اک نور ابلتا دیکھوں

ڈوبتے تاروں کے ہر نقطے سے لوں درسِ فنا
صفحۂ ماہ میں عبرت کا صحیفا دیکھوں

دے وہ توفیق سعادت تو کروں سجدۂ شکر
اک نئی روح کو قالب میں جھلکتا دیکھوں

لالہ و گل کے کٹوروں میں پیوں بادۂ شوق
چمنِ دہر میں میخانے کا نقشا دیکھوں

آنکھ میں چھائے جو مستیٔ مۓ ناب شعور | طور کے جلوے کو رہنِ خمِ و مینا دیکھوں
الفِ صیقل آئینۂ فطرت سمجھوں | لب جو سرو سہی کو جو اکڑتا دیکھوں
شاخساروں سے سنوں نغمۂ داودی کو | مرغزاروں میں رُخِ خضرِ تمنا دیکھوں
گوشے گوشے میں نظر آئے جہانِ امید | چپے چپے میں حقیقت کا خزانا دیکھوں
پتے پتے میں پڑھوں حسنِ ازل کی تفسیر | ریشے ریشے میں نہاں حسنِ آرا دیکھوں
ذرّے ذرّے سے ہویدا ہو جمالِ خورشید | قطرے قطرے میں نہاں قلزم و دریا دیکھوں
ڈوب کر بحرِ فنا سے جو نکالوں سرِ عجز | یم ہستیِ مجرد کا کنارا دیکھوں

آج تو ہیں گرو شوقِ دل و جاں ضامنؔ
کل کے دن مجھ کو دکھاتا ہے وہ کیا کیا دیکھوں

(۳)

غیرِ گدازِ دل نہیں بادہ بہ جامِ آرزو | سوختہ جانیوں سے ہے رونقِ شامِ آرزو
ہے یہ کمالِ زندگی، ہے یہ مآلِ زندگی | خاک بہ فرقِ مدعا، زہر بہ کامِ آرزو
لذتِ عشرتِ جہاں مجھ سے جو پوچھیے، تو ہے | بوئے کباب سوختہ گردِ مشامِ آرزو
موجِ سرابِ دشت ہے جلوۂ بے ثباتِ عیش | حسرتِ برق تاب ہے تیغِ نیامِ آرزو
نغمۂ بے اصول ہے شکوۂ جورِ آسماں | خونِ شفق نواز تھا بادہ جامِ آرزو
بوالہوس فضول، اور ترک ہوس محال ہے | پختۂ بے نیاز خلق کیسے ہو خامِ آرزو
شاخِ غزالِ دشت پر جیسے براتِ عاشقاں | ہے سرِ شاخسار وہم یوں ہی مقامِ آرزو

ضامنِؔ آبرو فروش کر چکے آرزو میں نام
کچھ بھی حیا ہے گر نہ لو اب کبھی نامِ آرزو

(٭)

حاتم طائی

از جناب مولوی مسعود علی صاحب بی اے

ہندوستان کے مسلمان عرب کے اکثر نامور سرداروں کو بھول گئے، مگر شعرائے عجم کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے حاتم کا نام بھولنے نہیں دیا۔ اور اس کی سخاوت اور فیاضی کی اس قدر حکایتیں سنائیں کہ ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہے۔ یہ قبیلۂ بنی طے کا مشہور سردار اور شاعر تھا۔ باپ کا نام عبداللہ بن سعید بن حشرج، اور ماں کا نام عتبہ بنت عفیف کہا جاتا ہے۔ حاتم کا باپ ایسے وقت میں مرگیا کہ حاتم بچہ تھا، اور اُس کا ولی اُس کا دادا سعد بن حشرج قرار پایا۔ اُس کی ماں عتبہ خوشحال اور فارغ البال عورت تھی، مگر حاتم کی ماں تھی۔ جو کچھ اُس کے پاس آتا تھا اس کو بیدریغ مہمانی اور داد و دہش میں صرف کردیتی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کے بھائیوں نے اُس کی تمام جائداد اُس کے تصرف سے نکال لی۔ اس سے عتبہ پر تکلیف گزرنے لگی چند روز کے بعد بھائیوں نے یہ خیال کرکے کہ جو تکلیف اُس کو پہنچی ہے، اِس سے اُسکی اصلاح ہوگئی ہوگی، اونٹوں کا ایک مختصر سا گلہ اس کے پاس بھیجدیا۔ اسی زمانہ میں قبیلہ ہوازن کی ایک عورت جو ہرسال اُس کے پاس امداد کے لئے آیا کرتی تھی، وارد ہوئی۔ اُس نے حسب معمول اس سے افلاس کا اظہار کیا، اور اس دریادل عورت نے اونٹوں کا وہ گلہ کا گلہ اس کے حوالے کردیا، اور یہ اشعار پڑھے ؎

لعمری لقد ما عضنی الجوع عضۃ　　　فالیت أن لا أصنع الدھر جائعاً

شرح:۔ عض، کاٹا۔ الیت، میں نے قسم کھائی۔ الدھر، تمام عمر۔ جائع، بھوکا

معنی:۔ مجھ کو اپنی جان کی قسم جب سے میں نے بھوک کی تکلیف اٹھائی ہے، میں نے قسم کھائی ہے کہ میں کسی بھوکے کے سوال کو کبھی رد نہیں کرونگی۔

فقولا لهذا اللائمی الیوم اعفنی　　فان انت لم تفعل فعض الاصابعا

شرح :- اصبع جمع اصابع انگلیاں، عض الاصابع، افسوس کرنا، ندامت اٹھانا۔

معنی :- (اے میرے دونوں ساتھیو) میرے ملامت کرنے والے سے کہو کہ آج مجھے معاف رکھ، اور اگر تو ایسا نہیں کرتا، تو جا اپنی انگلیاں چبا۔

فما ذا عساکم ان تقولوا لاختکم　　سوی عذلکم او عذل من کان مانعا

شرح :- عسی شاید۔ عذل ملامت۔

معنی :- تم اپنی بہن سے شاید سوائے اپنی ملامت اور ان لوگوں کی ملامت کے جو مانع خیر ہیں، کچھ اور نہ کہہ سکو۔

وما ذا ترون الیوم الا طبیعتہ　　فکیف تبرکی یا ابن ام الطبائعا

معنی :- جو تم آج دیکھ رہے ہو، وہ سوائے فطرت کے اور کیا ہے ! پس اے میرے ماںجائے بھائیو! میں اپنی فطرت کس طرح چھوڑ دوں !۔

جو بچے ایسی ماؤں کی گودوں میں پرورش پائیں، اور فطرت نے بھی اُن کے ساتھ بخل نہ کیا ہو، وہ سوائے حاتم کے اور کیا ہو سکتے ہیں !۔ کہا جاتا ہے کہ حاتم کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ جو کچھ اُس کو کھانے کو دیا جاتا تھا، وہ تنہا نہیں کھاتا تھا، اور جو کچھ اُس کو مل جاتا تھا وہ بیدریغ لوگوں کو دیدیتا تھا۔ اس کے دادا نے جب یہ حال دیکھا تو اُس کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں کے ساتھ جاکر چراگاہ میں رہا کرے، اور اس کے لئے ضروری سامان مہیا کردیا۔

حاتم وہاں بھی اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ مہمانوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ مگر وہ گزرگاہ عام نہ تھی، اِس لئے مہمانوں کے ملنے میں دقت ہوتی تھی۔ ایک دن اسی تلاش میں نکلا۔ اتفاقاً اُس کو تین مسافر مل گئے، اور خود انہوں نے حاتم سے مہمانی کا سوال کیا۔ اس زمانے کے عربوں میں یہ کوئی معیوب امر نہ تھا؛ کیونکہ مہمان نوازی کو اپنی افزائش عزت کا سبب سمجھتے تھے، اس لئے مسافر بلا تامل یہ سوال کرتے تھے، کہ تم کو مہمان کی ضرورت ہے ؟ حاتم کو ہی

سوال پر تعجب ہوا۔ اُس نے کہا کہ تم اونٹ دیکھتے ہو، اور پھر ایسا سوال کرتے ہو! یہ تین شخص عبید بن ابرص، اور بشر بن ابی حازم اور النابغہ تھے؛ جو اپنے زمانے کے مشاہیر شعرا میں شمار ہوتے تھے، اور نعمان (منذر ثالث) بادشاہ حیرہ کے دربار کو جا رہے تھے۔ حاتم نے ان کے لئے تین اونٹ ذبح کئے۔ عبید نے کہا کہ ہم تو صرف تھوڑے سے دودھ کے طالب تھے، اور اگر ہم کو کھانا کھلانا ہی ضرور تھا تو ایک اونٹ کا بچہ کافی تھا۔ حاتم نے کہا کہ میں اس کو خود جانتا تھا، مگر میں نے تمہاری وضع قطع سے معلوم کیا کہ تم مختلف حصۂ ملک کے رہنے والے ہو، اس لئے میں نے چاہا کہ تم میں سے ہر شخص یہ قصہ اپنی قوم میں جا کر بیان کرے۔ ان لوگوں نے حاتم کی مدح میں اشعار کہے ان اشعار کو سُن کر حاتم ایسا بیخود ہو گیا کہ اُس نے جتنے اونٹ تھے سب ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور قسم کھائی کہ اگر وہ اس ہدیہ کو قبول نہ کریں گے تو وہ تمام جانوروں کو بیکار کر دے گا۔ مجبوراً اُنکو منظور کرنا پڑا۔ ہر شخص کے حصے میں نوّے نوّے اونٹ آئے۔

جب اس واقعہ کی خبر حاتم کے ولی سعد کو پہنچی تو اُس کے حواس جاتے رہے۔ گھبرایا ہوا حاتم کے پاس آیا، اور پوچھا کہ اونٹ کہاں ہیں؟۔ حاتم نے جواب دیا کہ داداجان! میں نے ان اونٹوں کے ذریعے سے آپ کی گردن میں نیک نامی کا ایک ایسا طوق پہنا دیا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ سعد نے یہ جواب سُن کر قسم کھائی کہ وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں رہیگا، اور اپنا باقیماندہ سامان لیکر، اور حاتم کو وہیں چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔

اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے حاتم کہتا ہے ؎

وانی لعف الفقر مشترك الغنی　　وتارك شكلٍ و یوافقه شكلی

شرح:۔ عف رکا۔ شکل عادت، طبیعت، حدیث میں آیا ہے:۔ فسالت ابی عن شکل النبیؐ

معنی:۔ میں یقیناً تنگ حالی میں خوددار، اور خوشحالی میں سب کا شریک ہوں۔ اور ایسی عادت کا چھوڑ دینے والا ہوں جو میری عادت سے مختلف ہے۔

واجعل مالِی دون عرضِی جنته　　لنفسی واستغنی بما کان مِن فضلی

شرح :- عرض، عزت، آبرو۔ جنہ، ڈھال۔ فضل، جمع، مال، پس انداز

معنی :- میں مال کو اپنی عزت کی حفاظت کے ڈھال بنا لیتا ہوں، اور مال کو جمع کرنے سے بے پروا ہو جاتا ہوں۔

وماضرنی ان سار سعد باهله وافردنی فی الدار لیس معی اهلی

معنی :- اگر سعد مجھ کو گھر میں اکیلا چھوڑ گیا تو مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میرے ساتھ بال بچے نہیں ہیں۔

سیکفی ابتناء المجد سعد بن حشرج واحمل عنکم کل ما ضاع من نقل

معنی :- بزرگی قائم کرنے کے لئے سعد بن حشرج کافی ہے، اور جو مال ضایع ہو گیا اُس کا تاوان دینے کے لئے میں موجود ہوں۔

ولی مع بذل المال فی الحرب صولته اذا الحرب ابدت من نواجزها العصل

شرح :- صولتہ، دستگاہ، قوت، نواجذ، جمع ناجذ، کچلیاں، پھاڑنیوالے دانت۔ عصل، کجی۔

عرب لڑائی کو درندہ جانور سے استعارہ کرتے ہیں، اس لئے اُن کے محاورہ میں "حرب ابدت نواجذھا" کے یہ معنی ہیں کہ لڑائی نے اپنے دانت دکھائے؛ یعنی لڑائی شروع ہو گئی۔

اونٹ کے سامنے کے دانت عمر کے ساتھ ٹیڑھے ہوتے جاتے ہیں، اس لئے شاعر کہتا ہے کہ جب لڑائی میں امتداد زمانہ کی وجہ سے اشتداد ہو جاتا ہے۔

معنی :- مجھ میں سخاوت کے ساتھ شجاعت بھی ہے۔ جب لڑائی اپنے دانتوں کی کجی نمودار کرتی ہے؛ یعنی جب وہ شدید ہو جاتی ہے۔

ماویہ بنت عفزر حیرہ کی ایک مشہور حسین وجمیل اور صاحب مقدرت عورت تھی۔ اُس نے چاہا کہ حاتم سے تعلق پیدا کرے، مگر حاتم اس پر راضی نہ ہوا۔ اس خوف سے کہ مبادا زیادہ اصرار ہو، وہ راتوں رات حیرہ سے چل کھڑا ہوا۔ اس کے متعلق اُس نے ایک قصیدہ کہا ہے،

جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؛

حننت الی الاجبال اجبال طے　　وحننت قلوص ان رأت سوط حمرا

شرح :۔ حسن ، آرزومند ہوا ، نالہ کیا ۔ قلوص ، جوان اونٹنی ۔

معنی :۔ میں پہاڑوں اور خصوصاً طے کے پہاڑوں کا آرزومند ہوا ، اور میری جوان اونٹنی نے لال کوڑا دیکھکر نالہ کیا ۔

وانی المزج للمطی علے الوجا　　وما انا من خلانك ابنتہ عفزرا

شرح :۔ لمزج ، بڑھانیوالا ۔ مطی ، سواری ، وجا ، جانور کے پیروں کا زخمی ہونا ۔ خلان ، دوست ۔

معنی :۔ میں باوجود سواری کے جانور کے تھک جانے کے اس کو آگے بڑھا رہا ہوں اور اے عفزر کی بیٹی میں تیرا دوست نہیں ہوں ۔

فنادی الی جاراتھا ان حاتما　　اراہ لعمری بعد ناقد تغیرا

معنی :۔ وہ اپنی پڑوسنوں سے یہ کہتی ہے کہ میری جان کی قسم میں حاتم کو بدلا ہوا پاتی ہوں ۔

تغیرت انی غیرات لریبہ　　ولا قائل یوما الذی العرف منکرا

شرح :۔ ریبہ ، شک ، تہمت اور حوادث زمانہ ۔ عرف ، جوانمردی ، سخاوت اچھائی ۔

معنی :۔ میں یقیناً بدل گیا ہوں بغیر کسی بُرائی کے ، اور میں نے کبھی کسی اچھے آدمی کو بُرا نہیں کہا ہے ۔

فلا تسألبنی واسائی ای فارس　　اذالخیل جالت فی قنا قد تکسرا

شرح :۔ فارس ، سوار ، بہادر ۔ خیل ، گھوڑے ۔ جال ، گیا یا آیا ۔ قنا ، نیزہ ۔

معنی :۔ (میرے متعلق) مجھ سے نہ پوچھ بلکہ جس سوار سے چاہے پوچھ لے ۔ جس وقت گھوڑے ایسے معرکے میں در آئیں جہاں نیزے کثرتِ ضرب وطعن سے ٹوٹے ہوئے ہوں ۔

وانی لوھاب قطوعی و نا قتی   اذ اما انتشیت والکمیت المصدرا

شرح :- قطوع ، اونٹنیاں جو جلد دودھ دینا چھوڑ دیتی ہیں۔ مصدر ، قوی سینہ والا یا گھوڑ دوڑ میں آگے نکل جانیوالا۔

معنی :- میں عمدہ اور قوی اونٹنیاں اور تیز رو کمیت کا بڑا بخشنے والا ہوں، جب میں نشہ میں آجاتا ہوں۔

اخو الحرب ان عضت بہ الحرب عضہا   وان شمرت عن ساقہا الحرب شمر

شرح :- اخو الحرب ، لڑائی کا بھائی یعنی جنگجو۔ عض ، کاٹا۔ شمر ، دامن اُٹھا کے چلا ، یعنی بچکر۔

معنی :- اگر لڑائی سر پر آپڑتی ہے تو میں جنگجو ہوجاتا ہوں ، اور اگر وہ بچ کر نکل جاتی ہے تو میں بھی اُس سے اجتناب کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اُس وقت تو حاتم ماویہ سے بچکر نکل آیا ؛ مگر پھر اُس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ ماویہ کے ساتھ نکاح کرلے تو اچھا ہے۔ اس خیال سے وہ پھر حیرہ گیا ، اور اُس کا خواستگار ہوا۔ اُس زمانہ میں اُس کی خواستگاری کے لئے نابغہ اور ایک دوسرا نبیتی شخص بھی حیرہ میں وارد تھا۔ ماویہ نے تینوں کو بلاکر یہ فیصلہ کیا کہ تم لوگ اپنی اپنی قیامگاہ پر جاکر قصیدے کہو اور اِس میں اپنے نمایاں کاموں اور اپنے مناصب کا ذکر کرو۔ تم میں جو سب سے زیادہ کریم اور شاعر ثابت ہوگا اُس کے ساتھ میں نکاح کرونگی۔ اِن تینوں شخصوں نے اپنی اپنی قیامگاہ پر آکر اپنے اظہار شان اور سخاوت کے لئے اونٹ ذبح کئے۔ اور بڑے پیمانہ پر لوگوں کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا۔ ماویہ بھیس بدلکر ان میں سے ہر ایک کی قیامگاہ پر گئی ، اور اُن کی دعوتوں میں شریک ہوئی۔ بجز حاتم کے کسی شخص نے اُس کی پوری طرح خاطرداری اور تواضع نہیں کی۔ دوسرے دن یہ تینوں اپنی اپنی نظمیں لے کر پہنچے۔ ماویہ نے پہلے اُن کے قصیدے سُنے ، بعدہٗ ان کو کھانا کھلایا۔ کھانے میں یہ التزام کیا تھا کہ اونٹ کا جو حصہ جس کے یہاں سے اُس کو دیا گیا تھا وہی حصہ اُس نے اُن کے سامنے رکھوا دیا۔ یہی نبیتی اور نابغہ کے شرمندہ کردینے کے لئے کافی تھا۔

ماویہ نے جو فیصلہ سنایا وہ یہ تھا کہ حاتم تم دونوں سے زیادہ کریم اور بہتر شاعر ہے۔ یہ دونوں رخصت ہوئے، اور حاتم سے یہ چاہا گیا کہ وہ اپنی موجودہ بیوی کو طلاق دیدے۔ حاتم نے اِس سے قطعاً انکار کیا۔ ماویہ بغیر اس شرط کی تکمیل کے نکاح پر راضی نہ ہوئی۔ غرض کہ نکاح کا معاملہ تو درہم برہم ہوگیا، مگر ماویہ نے حاتم کو زادِ راہ دے کر بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ گھر پہنچ کر حاتم کو پھر ماویہ کی یاد ستانے لگی۔ اس اثناء میں اتفاق سے اِس کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ حاتم نے پھر اس کی خواستگاری کی اور ماویہ کے ساتھ اس کا نکاح ہوگیا۔

حاتم نے مقابلۂ متذکرہ بالا میں جو قصیدہ پڑھا تھا وہ اس کے کلام کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں؛ جن سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ بدوی عرب کے خیالات سخاوت وغیرہ کی نسبت کیا تھے؛

اماوی قد طال التجنب والهجر   وقد عذرتني في طلابكم العذر

شرح:- آ، حرفِ سوال ومخاطبہ ہے۔ ماوی، ماویہ ہے۔ عرب عام طور سے شعر میں نام کا آخر حرف ساقط کردینا جائز سمجھتے ہیں؛ مثلاً بجائے مالک کے صرف مال کہتے ہیں۔ تجنب، علٰحدگی، فراق۔ طلاب، طلب۔

معنی:- اے ماویہ! فراق اور ہجر نے طول کھینچا، اور تمھاری طلب میں اکثر موانع پیش آتے رہے۔

اماوی ان المال غاد ورائح   ويبقى من المال الاحاديث والذكر

معنی:- اے ماویہ! مال آنے جانے والی چیز ہے، اور مال کا صرف تذکرہ رہجاتا ہے۔

اماوی انی لا اقول لسائل   اذا جاء یوماً حل في مالنا النذر

معنی:- اے ماویہ! اگر میرے پاس کبھی کوئی سائل آجاتا ہے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا مال فلاں کام کی نذر کی ایفا کے لئے محفوظ ہے، اور میں اِس کو نہیں دے سکتا۔

اماوی اما مانع فبين   واما عطاء لا ينهنهه الزجر

شرح :- ، روکنا ، جھڑکنا.

معنی :- اے ماویہ ! (میں) یا تو صاف جواب دیدیتا ہوں ، یا (سائل کو) اس طرح دیتا ہوں کہ اس میں جھڑکی نہیں ہوتی.

اماوی مایغنی الثراء عن الفتی　　اذا حشرجت یوما وضاق بها الصدر

شرح :- الثراء ، ثروت ، دولت ، حشرجته ، گلے میں جان کا پھنسنا.

معنی :- اے ماویہ ! دولتِ انسان کو اس وقت سے نہیں بچا سکتی ، جبکہ اس کی جان گلے میں اٹکی ہو ، اور اس کی وجہ سے وہ تنگ دل ہو.

فانی لاآلو بمالی صنیعۃً　　فاولہ زاد وآخرہ ذخر

شرح :- الو ، تقصیر کی . صنیعۃ ، کام.

معنی :- میں اپنے مال سے ایسا کام کرنا نہیں چھوڑتا ، جس کا اوّل توشۂ دنیا اور آخر توشۂ آخرت ہو.

فما زادنا بغیا علی ذی قرابتہ　　غنانا ولا ازری باحسابنا الفقر

معنی :- ہماری دولت مندی نے ہم کو اہلِ قرابت سے سرکش نہیں کردیا ، اور نہ ہمارا فقر ہماری عزت کو بگاڑ سکا.

بعینی عن جارات قومی غفلۃ　　وفی السمع منی عن حدیثہم وقر

معنی :- میں اپنی قوم کی پڑوسنوں کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا ، اور پڑوسنوں کی برائی سننے سے میرے کان بہرے ہیں۔

وقد علم الاقوام لو أن حاتما　　اراد ثراء المال کان لہ وفر

معنی :- لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر حاتم مال جمع کرنا چاہتا تو بہت مال جمع کرلیتا.

حاتم کی سخاوت کے بیسیوں قصے ہیں ، جن کی گنجائش اس جگہ نہیں نکل سکتی . ماویہ کے بطن سے حاتم کا ایک لڑکا عدی اور ایک لڑکی سفانہ زیادہ تر مشہور ہیں ؛ کیونکہ ان دونوں نے حضرت رسولِ خدا کا زمانہ پایا ، اور دونوں مشرف باسلام ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت

علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مجمع میں فرمایا کہ "اکثر لوگ کارِ خیر سے پہلوتہی کرتے ہیں، مجھکو اُن لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جن کے پاس اُن کا کوئی بھائی ایک حاجت لیکر آتا ہے، اور وہ اِس کو رفع کرسکتے ہیں، اور نہیں کرتے۔ اگر ہم جنت دوزخ اور عذاب ثواب سے قطع نظر بھی کرلیں تب بھی ہم کو مکارمِ اخلاق کا خیال ہونا چاہیے، کیونکہ وہ نجات کا راستہ ہے۔"
اِس کو سُن کر مجمع میں سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس نے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین اگر اجازت ہو تو میں اِس بارہ میں جو کچھ میں نے حضرت رسول اللہ سے سُنا ہے وہ عرض کروں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے کیا بہتر ہے، ضرور سناؤ۔ اُس شخص نے کہا کہ جب قبیلۂ طے کے لوگ گرفتار ہوکر آئے تو اُن میں ایک لڑکی نہایت حسین وجمیل تھی۔ میں اُس کو دیکھ کر فریفتہ ہوگیا، اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب غنیمت تقسیم ہونے لگے گی تو میں حضرت سے عرض کرکے اس کو اپنے حصہ میں لے لوں گا۔ میں یہ خیال کرہی رہا تھا کہ اُس لڑکی نے حضرت رسولُ اللہ کو مخاطب کرکے نہایت فصیح وبلیغ الفاظ میں عرض کیا کہ "اے محمد! میں ایک یتیم لڑکی ہوں، اگر آپ کو یہ مناسب معلوم ہو تو مجھے چھوڑدیں؛ کیونکہ میں ایک سردارِ قوم کی لڑکی ہوں۔ میرا باپ حاجتمندوں کی حاجت روائی، اپنی قوم کی حمایت، مہمانوں کی خاطرداری، غمزدوں کی غمگساری کرتا تھا، اور اِس نے کبھی کسی کا سوال رد نہیں کیا؛ یعنی میں حاتم کی بیٹی ہوں"۔ حضرت رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا کہ "اے لڑکی! یہ مومن کے اوصاف ہیں، اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے ضرور طلبِ مغفرت کرتے"۔ اور اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ "اِس کو چھوڑدو؛ کیونکہ اس کا باپ مکارمِ اخلاق کو پسند کرتا تھا، اور اللہ بھی اس کو پسند کرتا ہے"۔ اِس حکایت کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی بوستاں میں نقل کیا ہے۔
عدی حاتم کا لڑکا بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ اور ایک عرصہ تک حضرت رسالت پناہ کی صحبت میں رہا۔
ابن اعرابی لکھتے ہیں کہ حاتم کا شمار عرب کے شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ بڑا سخی تھا۔ اس کا کلام اِس کی سخاوت کے مشابہ اور اِس کا فعل اس کے قول کا موید ہوتا تھا اور جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اُس میں کامیاب ہوتا تھا۔

ضعیفہ

از جناب مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر
مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر

اور کس موسم میں؟ جب طاعون ہے پھیلا ہوا
ذرہ ذرہ ہے وبا کے خوف سے سمٹا ہوا

رات آدھی آ چکی ہے، بام و در خاموش ہیں
اہلِ دولت بسترِ راحت سے ہم آغوش ہیں

گوشہ گوشہ شہر کا اک مرکزِ آفات ہے
کانپتی ہے روح، اُف کیسی بھیانک رات ہے!

آہ اے بیکس ضعیفہ! غم کی ترپائی ہوئی
وائے اے مظلوم! اے دنیا کی ٹھکرائی ہوئی

تو کہاں کی رہنے والی ہے، ترا کیا نام ہے؟
سچ بتا تو آہ کس آغاز کا انجام ہے؟

تیرے بچے، تیرے گردوں کے ستارے کیا ہوئے؟
اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے؟

آہ! ارمانوں کی کیسی پائمالی ہو گئی
ٹھوکریں کھانے کو تیری گود خالی ہو گئی

تیرا وارث سو رہا ہے کس جگہ اوڑھے کفن؟
دفن ہے کس قبر میں تیرا عروسی پیرہن!

حرزِ جاں ہوگا کبھی شوہر کو نظارہ ترا
آج فرشِ خاک ہے افسوس! گہوارہ ترا

رہگزر میں تو پڑی ہے آہ! کس انداز سے
تجھکو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے

یاس کی تاثیر کیوں چہرہ پہ دونی ہو گئی
اُنکا ویراں ہوا، سسرال سونی ہو گئی

ہند میں انسانیت کا درد بھی باقی نہیں!
ملک میں کیا تیرے اب اک دو بھی باقی نہیں!

تیری ہستی اک سزا ہے ملک و ملت کیلئے
تو ہے اک داغِ جبینِ اہلِ دولت کے لئے

تو ہے اک تمثیل ادبار و ملل کے واسطے
طوق ہے لعنت کا اربابِ دول کے واسطے

سخت حیراں ہوں کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار
کیوں زمیں میں گڑ نہیں جاتے حیا سے الدار

پڑ نہیں جاتے الٰہی! سینۂ دولت میں داغ
بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تابِ زر سے اے دولت پناہو! ہوشیار
اپنے تاجوں کی چمک سے بادشاہو! ہوشیار

خوابِ سفاکی سے اے غفلت شعارو! چونک اٹھو
اے ہلاکت آفریں سرمایہ دارو! چونک اٹھو

ظالمو! تیار ہو جاؤ سزا کے واسطے
قوم کا افلاس اٹھا ہے بددعا کے واسطے

گوہر و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں
سرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں

فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں
خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بیتاب ہیں

جلد اٹھو امداد کی شمعیں جلانے کے لئے
قہرِ حق بےچین ہے جنبش میں آنے کے لئے

لطیفہ۔ مسٹر سید عسکری حسن اور مسٹر سید یوسف حسن تعلیم کی غرض سے ولایت جانے لگے، تو اس خیال سے کہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے وہاں انسان کو ترکِ لذات کرنا پڑتا ہے، اول الذکر نے گھر کے باورچی خانہ میں آنا جانا شروع کیا، اور تھوڑے دنوں میں وہاں کے سارے بھید بھاؤ سے واقف ہو گئے۔ ولایت پہنچے تو ایک باورچن رکھی، اور اُسے بھی اپنے ڈھب کا بنالیا۔ ہندی دوستوں کو بھی اس کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے فرمائش شروع کردی۔ عسکری کو کمال دکھانے کا موقع اچھا تھا انھوں نے فرمائشوں کو قبول کرلیا۔ آنے اور کھانے والوں کے سب نام تو یاد نہیں، سنتے ہیں کہ اس موقع پر ان دو بھائیوں کے سوا مسٹر احمد کمال، مسٹر نظام الدین، مسٹر وحید الدین حیدر، مسٹر حید رحسین اور شاید مسٹر حامد خاں شروانی موجود تھے۔ میزبان نے تمام ہانڈیوں میں لال مسالہ ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا۔ باورچن نے یہ خیال کر کے کہ سالن میں مرچیں نہیں ڈالی ہونگی مٹھی بھر ڈال دیں اور خود ہاتھ دھونے باہر چلی گئی۔ مستانی [illegible] بی نے بھی اس خیال سے کہ کالا ہوگا مرچیں بہت کھاتا ہے، غرض بھی اپنی بہت سی [illegible] میں ایک کا اضافہ فرما دیا۔ اب سالن بہت آتشیں ہو چکا تھا مگر کھانے والے پیٹ صاف کر کے [illegible]

خوابِ پریشاں

از جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی۔ اے

کل آتشکدۂ شاہ پور کا مُغ، اردبیل کے پہاڑوں سے اُتر کر عالم رویا میں میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ "اے پُرانی جنس کے پرکھنے والے، تجھ کو کچھ خبر ہے، کہ اقلیم ہند کا وہ فلسفی کیا ہُوا، جس کو ربّ الشمس ابولوس کے مندر سے، یونان کی دیبوں نے اس بھارت ورش میں بھیجا تھا، کہ تزکیۂ نفس و ریاضت علیہ میں مصروف ہو، حتیٰ کہ اپنے کالبد خاکی کو مومیائی میں تبدیل کر کے مصر قدیمہ کے کسی تنگ و تاریک تہ خانے میں بطور یادگار محفوظ کر جائے۔

اَب سُن کہ ایک رات، پچھلے پہرے، جبکہ آتشکدہ اردبیل سے، شعلہ زردشت، ہر دشت وجبل میں دور و نزدیک پیدا تھا، میں تجلی خالق کا مظہر بنکر، اہرمن کے طبقۂ ظلمت میں، نور کے ذرّے اڑاتا لبنان کے پہاڑوں کی طرف چلا، اور جب ان کی ایک شاداب وادی سے گذرا تو دیکھا کہ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی میں، بیت اللحم کے ایک نجّار اور ایلیا کے چند لکڑ ہارے، لبنان کے اشجار کہن سال کو، جن کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں، دایناڈیی کے آہوانِ سیہ چشم، ہری ہری دوب چرا کرتے تھے، تیشہ و تبر سے کاٹتے ہیں۔

اتنے میں آفتاب کہ خالق لیل و نہار ہے، افقِ مشرق سے بلند ہو کر، کوہسار پر چمکا، اور میں نے دیکھا، کہ قریب ہی درختوں کے جھرمٹ میں، یونان کا مشہور حکیم اور صناع ارشمیدس نامی، کہ جزیرہ صقلیہ میں دفن تھا، اپنی لحد چھوڑ کر ہاتھ میں بیرم اور شاقول لئے، فکرمند کھڑا ہے اور حکیم اقلیدس رودِ نیل کا مشہور مسّاح مسطر و پرکار لئے، ارشمیدس سے کچھ باتیں کرتا ہے۔ چشمِ بصیرت حیرت زدہ تھی، کہ ایلیا کے لکڑ ہارے، لبنان میں کیوں درختوں کو گراتے ہیں، اور بیت اللحم کے نجار کیوں شہتیر و تختے تیار کرتے ہیں۔ اقلیدس و ارشمیدس صنعت میں مصروف ہیں

اور میں حیران ہوں کہ وہ کون سے اعمال ریاضیہ ہیں، جو اس وقت، اِن اساتذۂ سلف سے اجرا پاتے ہیں، اِس تجسّس سے عہدہ بر آ ہوا تھا، کہ درختوں کی اوٹ سے، ایک تیر کے فاصلے پر، ارض عمون سے، بیر سبع کے چرواہے، کہ جبرا کی وادی میں، اسحاق کے چرواہوں سے، تکرار کر چکے تھے، شاعر اومیرس کے مینڈھے کو، کہ سنہری اُون رکھتا تھا لئے آتے ہیں اور سُن! کہ بیت اللحم کے نجار نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیا، اور ایلیا کے لکڑہاروں نے، بیر سبع کے چرواہوں کو، دیکھ کر نعرے بلند کئے، اور ان کے نعرے، لبنان کی گھاٹیوں میں گونج اُٹھے اور بیر سبع کے چرواہے ایلیا والوں کے پاس پہنچے۔

اور اب درختوں کے جھرمٹ میں، ارشمیدش، صقلیہ کے مدفون نے جیب کفن سے مقراض نکالی، اور اقلیدس نے عیش اومیرس کی پشت سے اُون کاٹی، اور جب اندوختہ کافی ہوا، تو سب نے ملکر ایک رسّی بٹی، اور اتنے میں شامیوں نے ایک تختہ تیار کیا، کہ "ہمشکل اسطرلاب تھا، مگر فعل اُس کا عمل اسطرلاب سے فرق رکھتا تھا" یہ کام ختم ہوئے ہی تھے، کہ مشرق کے بندر گاہوں سے، کلدانی ملاحوں کا ایک گروہ آیا، اور سب نے تختہ اُٹھا کر سر پر رکھا، اور ساحلِ شام کی طرف چلے، جبکہ صقلیہ کا ارشمیدش، مصر قدیم کا اقلیدس، بیت اللحم کے نجار، اور ایلیا کے لکڑہارے، اومیرس کا مینڈھا، اور بیر سبع کے چرواہے پیچھے پیچھے ہو لئے اور بہت سی منزلیں طے کرکے، یہ صیدون میں پہنچے کہ لب بحر واقع تھا۔ یہاں کلدانیوں کا جہاز تھا کہ ارغوصہ کے لئے مال بھر چکا تھا اِس جہاز پر یہ سب مع سامان کے سوار ہوئے۔

شبِ تار نے ارض و سما پر ظلمت شایع کی تھی؛ "برج عقرب سنبلہ سے حد شرق میں ابھی دقیقے خارج ہوا تھا، اور زحل کا اقتران عطارد سے مرتبۂ کمال کو نہ پہنچا تھا، کہ ناخدا نے لنگر اُٹھایا۔ ارشمیدش، جو خشکی کے سفر سے پہلے ہی خستہ ہو چکا تھا، سو گیا۔ اقلیدس فکرِ مساحت میں اختر شمار ہوا۔ بیت اللحم کے نجار کی آنکھ بھی لگ گئی۔ اومیرس کا مینڈھا، اومیرس کے کلام پر جگالی کرتا ہے، تاریک موجوں پر چمکتے تاروں کا عکس ہے۔ بحر یونان سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں، اور کشتی کسی نیم جاں کی طرح سیاہی میں پڑی، اپنے نحیف پروں کی حرکت سے

شنا و ظلمت ہے،

اے شخص! تو حیرت کریگا کہ میں اُس منظرِ عجیبہ کا جو پیش آنیوالا تھا، کس عنوان تماشائی ہُوا! سُن کہ وادیٔ لبنان سے، جب یہ قافلہ ساحل شام پر پہنچا تو زمین پر تاریکی تھی اور فلک ارباب ضیا کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میں، کہ پرستندۂ نور ہوں "برج جدی" میں پہنچا اور ایک انجم کی شعاع پر سوار ہوکر جہاز کے ساتھ ساتھ ارغوصہ کو چلدیا۔

صبح کا ستارہ کہ نقیب آفتاب ہے، طلوع ہوکر اُفق پر قدرے مرتفع ہوا تھا کہ "شعلۂ اعظم" کی ضیا نے مشرق سے اُٹھ کر، اس کے نورِ مستعار کا خاتمہ کر دیا۔ اور کلدانی جہاز، یونان کے پانی میں ارغوصہ کے سامنے لنگر انداز ہوا، اور ارغوصہ کے شہر والوں نے جوق جوق اُس کا تماشا کیا۔

اے نشیمن رویا کے عزلت گزیں مطلع ہو کہ دوسرے ہی دن، رودِ نیل کے دہانے سے چلا ہوا ایک سفینہ ارغوصہ میں پہنچا، اس سفینہ میں وہ قافلہ تھا جو سرزمینِ ہند سے چلکر عمان و عرب و احمر کے سمندروں کو طے کرکے خشک و تر راستوں اور بیابانوں سے مصرِ قدیم کے شہر تھیبس میں آیا تھا اور یہاں سے رودِ نیل کے ذریعہ ساحلِ بحر پہ پہنچکر ارغوصہ کو اُس نے جہاز لیا تھا، اسی سفینہ میں مشرق کا وہ حکیم، فلسفۂ باطل کا متوالا "شائق اسطرلاب"۔ "مصنف ارمغان" ہے جس کو ربّ الشمس کی دیبیوں نے، اقلیم ہند میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ اساتذہ یونان کے علوم و فنون کی ترویج میں جاں بحق سپرد کرے، اور بعد الموت اس کے اجزائے باقیہ کی مومیائی تیار ہوکر مصر کے کسی ظلمت کدے میں بطور یادگار رکھی جائے، مگر اب ان ہی دیبیوں نے اُس پر طرح طرح کے الزام عاید کرکے بغرض پاداش اس کو بیت الحکمت اثینہ میں طلب کرالیا ہے۔

یونان قدیمہ کا دارالحکومت ایک فرسنگ پر ہے، اور حصار اثینہ کی بلند عمارتیں نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں، بُت خانہ ابولوس کے سامنے جس کو زمانہ نے شرف قدامت اور عناصر نے خلعتِ بوسیدگی دیا ہے، یونان قدیمہ کے ہر زمانہ و عہد کے باکمال اپنی اپنی حجروں سے

اُٹھکر جمع ہوئے ہیں، عوام الناس بھی ہیں، لیکن حکما کا طبقہ علٰحدہ ہے۔ باہمی سرگوشیاں ہو رہی ہیں، ثالیس حکیم اپنے مونس اناشیمانوس کے افکار حکمیہ پر معترض ہے، دیو جانس کہ ایالونیہ کا باشندہ ہے، ہرقلاطیس سے مجادلہ کرتا ہے کہ نار اور صرف نار، وہ ذات ہے جس میں صفات باری پوشیدہ ہیں، پھر عدد جوہر بالذات کیسے ہو؟ سقراط برہنہ سر کمبل کی کفنی گلے میں، ننگے پاؤں ایکطرف کھڑا ہے۔ جوانانِ اثینہ علم وحُسن کے بتکدے میں نذریں چڑھانیوالے، اُستاد کے گرد حلقہ کئے ہیں، اگر حکیم کی جرح سے سب حواس باختہ ہیں۔ فلاطون بھی موجود ہے، مگر ارسطو کی طرف نگاہ غضب رکھتا ہے۔ ارسطو بھی استاد سے دل میں شرمندہ ہے، اور دفع اوقت کے لئے برقلس سے اسکندر مقدونی کا ذکر چھیڑتا ہے۔ بطلیموس اور جالینوس ہاتھ میں ہاتھ دبے کھڑے ہیں، مگر چہروں پر غصہ ہے، کہ اتنے میں ارشمیدس کو دیکھتے ہی اکثر اہل کمال تعظیم کو بڑھے۔ سرگوشیاں بند ہوئیں، اور سب کے بشرے سے انتظار کی بے چینی ظاہر ہونے لگی، کہ دور سے ایک غبار نظر آیا۔ دیکھا تو شہر کے دروازوں سے ایک گروہ آتا ہے جس میں سب کے آگے اسپارطہ کے سپاہی زرہ بکتر لگائے، خود پہنے، مِغفر نیچے کئے، ہاتھوں میں برچھے تولے، ایک عجیب الخلقت ذی حیات" کو حراست میں لاتے ہیں اور پیچھے پیچھے بیت اللحم کے نجار ہیں، کہ تیشہ و تیر دوش پر ہے، اور کلدانی ملاحوں کے ساتھ ایلیا کے لکڑہارے ہیں کہ کندھوں پر تختہ اٹھائے ہیں اور ان کے پیچھے بیرسبع کے چرواہے ہیں کہ اومیرس شاعر کے مینڈھے کو، رسی میں باندھے تے ہیں۔ یہ کل گروہ اس شان سے بت خانہ اپولوس کے سامنے پہنچا۔

بیت اللحم کے نجار نے، کلدانیوں کی مدد سے، شہتیر نصب کرکے تختہ کھڑا کیا، اور بیرسبع کے چرواہوں نے، اومیرس کی روح سے اجازت لیکر شہتیر میں رسی باندھی؛ ایلیا کے کاریگروں نے تختہ کے ایک طرف سیڑھی لگائی؛

یہ "جرِ ثقیل" ختم ہوا تھا کہ بت خانے کے سامنے ویرانوں میں، یونان کے سب اہلِ کمال اپنے اپنے پوستین پہنکر، چبوتروں پر ہو بیٹھے، اور فوراً ایک مجلس شوریٰ بہ اختیارات عدالت تعزیری منعقد ہوئی کی خود داری نے اُن کو منعقد کیا، اس لئے ارسطاطالیس حکیم صدر انجمن قرار پایا۔

برقلس نے کہ بزمیہ محاسن کے ساتھ رزمیہ اوصاف بھی رکھتا تھا، "فیلسوف ہندی" کو حراست سے علٰحدہ کرکے مجلس کے سامنے پیش کیا۔ صدر انجمن اور حاضرین کے متوجہ ہوتے ہی ارسطوقوس حکیم اپنے پتھر پر سے اٹھا اور بابیرس کا قرطاس جیب سے نکال کر اُن تمام الزامات متعلق بہ تخریب علوم قدیمہ کو پڑھکر سنایا، جن کی پاداش کے لئے یہ حکیم ہندی آج اساتذہ یونان کے دربار میں حاضر لایا گیا تھا۔ اے واہمہ کے بے جان پتلے اگر تو اُن الزاموں کا علم سامعہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو ذرا حکیم ارسطوقوس کی تقریر سُن۔

ارسطوقوس۔ اے اراکین مجلس شوری! اور اے اکابر و اعیانِ دولتِ فلسفہ! آج میں علما و فصحاء اغریقی اور اِن کے مخترع علوم وفنون کی جانب سے وکیل ہوکر، اس مجلس عدالت میں وہ شکایات پیش کرتا ہوں، جنہوں نے ہماری ہزارہا برس کی نیندیں اُچاٹ کردی ہیں، ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جن کو ہم نے مثل اپنی اولاد کے اس دنیا میں چھوڑا تھا، یہ حکیم باوجود خاص ہدایات کے، نہایت غفلت اور ناقدر دانی سے پیش آیا، حتیٰ کہ صبر وتحمل ہم سے رخصت ہوا، اور اس کے تدارک کے لئے، ہم سب کو آج یک لخت اپنی اپنی لحد سے اُٹھنا پڑا۔ وہ حکما اس مجلس میں موجود ہیں، جن کو خاص طور پر اس حکیم ہندی سے شکایات ہیں۔ اولاً حکمائے اقلیدس ارشمیدس بطلیموس وجالینوس ہیں، جو علوم ہندسہ، ہیئت، طبیعیات وطب کے حامی وشفیع بنکر اس مجلس سے دادرسی کے خواستگار ہیں۔ ثانیاً فلسفیان متقدمین سے ثالیس حکیم مع انا ثیمانوس، ہرقلاطیس اناسیغورس سائل ہیں، کہ الٰہیات۔ فلسفہ۔ منطق۔ اور ادب پر جس طریقہ سے اس ہندی حکیم نے دستِ تطاول دراز کیا ہے اُس کی مکافات ہو۔ ثالثاً ارسطاطالیس صدر انجمن خود مستغیث ہوکر اپنے افکار طبعزاد مثلاً ریطوریقا۔ بوطیقا اور رقاطیغوریاس کی طرف سے فریادی ہے۔ رابعاً حکیم فیثاغورس فضائے عالم کا بین کار، آسمانوں کا سرنگیا فن موسیقی کی بے قدری کا شاکی ہے کہ نغمۂ افلاک سے یہ حکیم کبھی متاثر نہ ہوا، بلکہ عمداً اس سے متنفر رہا۔ اور اومیرس صبح آفرینش کا شاعر باکمال فنِ شعر کی طرف سے فغاں برلب ہے کہ اس فلسفی سے اسلوبِ کلام کی کبھی داد نہ ملی۔ آخر میں خطۂ یونان کے کاملینِ فنِ بت تراشی حاضر ہیں، جن کی صنعتوں میں بتوں کے حسنِ ظاہر کے ساتھ

ان کا حسنِ باطن بھی مجروح نظر آتا ہے، اُن کو شکایت ہے کہ اس حکیم نے اپنی شکل اور ترکیبِ اعضا میں عمداً اس کثرت سے ذمائم پیدا کر لئے ہیں کہ ہماری چشمِ حسن بیں میں وہ ایک خار بن گیا ہے بالخصوص اس کی ریشِ مخروطی کو ملاحظہ کیجئے، کہ زنخداں سے خارج ہوتے ہی ایک بدنما زاویہ اختیار کر کے دہن کے محاذات میں ایک ایسا قوس معکوس پیدا کرتی ہے جو قطعاً قواعدِ حسن کا منافی ہے، نیز حواس خمسہ کے لئے جو اعضاء متناسب کا پورا پورا لحاظ کر کے، اس کے کاسۂ سر میں نصب کئے گئے تھے، اُن کو بھی کثرتِ استعمالِ ادویۂ خود ساختہ سے بے کار و مضمحل و بدنما کر لیا، اور آئینِ خود آرائی کا مطلق پابند نہ رہا۔

پس میں ارسطوتوس حکیم جملہ اربابِ حکمت کی طرف سے جن میں متقدمین و متوسطین و متاخرین سب ہی شامل ہیں، اس دربارِ عالی وقار میں، کہ محلِ عدالت ہے مستدعی ہوں، کہ اس مخرب علوم و فنونِ قدیمہ کا، اُس مرتبہ اور عزت کے شایاں جس کا مستحق ہمارا ایک حریفِ متعالی ہو سکتا ہے کوئی تدارک فوراً کیا جائے اور چونکہ اس کے جرائم علیہ کی نسبت، بت خانہ ولقائی کی کاہنہ نے ثبوت سے پہلے ہی سزا تجویز کر کے اہلِ حکمت کے قلوب کو روشن کر رکھا ہے اس لئے تصریح الزامات بغرضِ ثبوت غیر ضروری ہے۔ محض حکمِ سزا کافی ہے اور تجویزِ سزا میں ایسے حکمائے یونان اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ہند کا یہ مصنوعی فلسفی، بہزار آفات برّی و بحری و مصائبِ ارضی و سماوی گرفتار ہو کر اس دربارِ عالم میں جہاں قلم و حکمت کے روساء عظام رونقِ بزمِ عدل ہیں حاضر کیا گیا ہے، تاکہ اپنی ہستی ناپائدار کی صفات متنوعہ و شیونِ مختلفہ میں جو جو شدائد اس سے عمل میں آئے ہیں، اور سوفسطایانِ ننگ نوش کی صحبت سے متاثر ہو کر علم و حکمت کے شیشہ ناب میں زندقہ اور الحاد کی افیون جس جس طریقہ سے اس نے گھولی ہے اُس کی سزا کو وہ پہنچے، اور آخر الامر اس کے جسدِ خاکی پر جس کا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جائے۔"

ارسطوتوس اس قدر تقریر کر کے بیٹھ گیا، کسی حکیم پر اس کی جادو بیانی کا مطلق اثر نہ ہوا لیکن مشورہ کے لئے اپولوس کے بت خانے میں سب کے سب چلے گئے اور مشورہ کے بعد باہر آ کر اپنے اپنے پتھر وں پر ہو بیٹھے مجمع عوام میں، جب کسی قدر خاموشی ہوئی تو صدر انجمن ارسطاطالیس اپنے اونچے پتھر سے

اٹھا اور بولا!

ارسطوتوس اور اے حکمتِ یونان کے دو او پرستر حکیمو! اس مقدمہ میں متقدمین و متاخرین دونوں نے باہمی مشورہ کرکے، بذریعۂ اناتیغورس حکیم اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کیا ہے، اور میں مجبور ہوں کہ اس ہندی حکیم کے حق میں وہ تجویز سناؤں، باطن میں جس کا علم پہلے سے موجود ہے لیکن ارسطوتوس نے خاتمۂ تقریر پر حکمائے یونان کی طرف سے استدعا کی ہے کہ مجرم کے کالبدِ خاکی پر، جس کا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جائے۔ اس کو ہم منظور کرتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کی رُوح پر بھی ایک جو ہر پاک اس ہستی کا ہے اور جس کی ماہیت پر ہم قادر نہیں ہیں، ایسا ہی کوئی عمل ہو۔ پس حکمِ آخر یہ ہے کہ اس حکیم مجرم کو جس کو ارسطوتوس نے بعض موقعوں پر ہندی فیلسوف بھی کہا ہے، اُس تختہ کے ذریعہ سے جس کو ایلیا والوں نے، اور بیت اللحم کے نجار نے جبل لبنان کے اشجار سے تیار کیا ہے، اور بہ سبیل اُس رسن کے جس کو بیر سبع کے چرواہوں نے میش او میرس کی سنہری اُون سے بٹا ہے، طبقۂ فنا میں معلق کر دیا جائے، اور اسی طرح معلق رہے، تاآنکہ اس کا جسم روح سے پاک ہو اور آخر میں میں ارسطاطالیس جملہ صدر نشینانِ بزمِ حکمت کی حضور میں بعوض اُس حقِ خدمت کے جو صدر انجمن ہونے کی وجہ سے مجھکو ملنے والا ہے، ملتمس ہوں کہ اس حکیم ہندی کی روح کو، جب وہ قیدِ عناصر سے آزاد ہو حکیم افلاطون اپنے مخترع عالمِ امثال میں لے جائے تاکہ کچھ زمانے کے لئے اس کو سکون اور ہم کو چین ہو اور وہ جلد کسی قالب مہیب کو اختیار نہ کر سکے۔ اور نیز اساتذہ متقدمین سے، درخواست ہے کہ عناصر اربعہ سے جو عنصر، اس حکیم مجرم کا علت العلل ہو، اُس میں اس حکیم کے اجزائے فانی جذب کر لئے جائیں۔

ارسطاطالیس کا فیصلہ منظور ہُوا۔ اثینہ کے تماشائیوں کا ہجوم اور زیادہ ہو گیا، اور دیونس کلبی جلادی کے لئے خمِ حکمت سر پہ رکھے، کتے کی رسّی کمر میں باندھے آیا، اور تختہ کی طرف گیا! او اے عالمِ رویا کے تماشائی سمجھ لے کہ پھر وہ ہی ہوا، جس کو ربّ الشمس کی دیبیوں نے چاہا تھا، او سرزمین ہند کا فلسفی طبقہ فنا میں معلق کر دیا گیا اور حکیم افلاطون اس کی روح کو عالمِ امثال میں لے گیا۔ لیکن عناصر نے اس کے کل اجزائے فانی کو قبول نہ کیا۔ اور حکیم کی مومیائی نعش کے

ایک بت خانہ میں دنیا کی یادگار بنی۔

اور پھر سب دیسی بدیسی اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ ارشمیدس صقلیہ پہنچکر اپنی لحد مستطیل میں جا سویا۔ اقلیدس ساحل نیل پر روپوش ہوا۔ یونان والے اپنے اپنے ویرانوں میں جا چھپے۔ کلدانی اپنا جہاز اثینہ سے لیکر شام کے بندرگاہوں میں آئے۔ پھر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ بیت اللحم کا نجار بیت اللحم کو، اور ایلیا کے لکڑ ہارے ایلیا کو گئے۔ اوبیرس کا مینڈھا جرجان کے پہاڑوں میں چھوٹ گیا۔ بیرسبع کے چرواہے جرار کی وادی میں گلے چرانے لگے۔ اور ہیں آتشکدہ شاپور کا مجمع اردبیل کے پہاڑوں کو واپس آیا۔ پس جو کچھ تو نے سنا اس پر حیرت کر اور اس خواب پریشاں سے بیدار ہو۔ (سنہ ۱۸۹۴ء)

―――――― (۰) ――――――

نوائے ترمذی

از جناب مولوی سیّد سراج الحسن صاحب ترمذی

ہزار ہر بادیہ نوردی، نہ ہو گا راز آشکار اپنا
جنوں کے لطف و کرم ہیں ایسے، رہیگا وہ پردہ دار اپنا

چنے ہیں گلچیں نے پھول ایسے، چمن میں اب خاک اڑ رہی ہے
خدا نہ دکھلائے یوں کسی کو، جہاں میں لٹتے دیار اپنا

عبث ہے شکوہ تو نے تجھکو، گلہ ہے تیرا فلک سے بیجا
کیا ہے ہاتھوں سے دفن تو نے، جہاں میں سارا وقار اپنا

میں کس مپرسی کے دور میں ہوں، مثالِ ذرّاتِ خاکِ پا ہوں
کبھی تو چمکیگا مہر بن کر، جہاں میں یہ انکسار اپنا

بسیطِ دریا ہے، دور ساحل، بپا ہے موجوں کا ایک طوفاں
شکستہ کشتی ہے، رات اندھیری، نہ کوئی یاور نہ یار اپنا

ہے پتہ پتہ میں رنگ اسکا، عیاں گلوں میں اسی کا جلوہ
چمن میں چپہ چپہ کے حسنِ فطرت، دکھا رہا ہے سنگھار اپنا

برہنہ پائی میں لطف باقی، نہ سینہ چاکی میں کچھ مزہ ہے
نکل اب اس دشت سے جنوں پھر بنا نیا خارزار اپنا

مئے کہن پھر پلا دے ساقی! دکھا دے پھر جلوئے ماضی
پرانی تانوں کو چھیڑ مطرب، کہ پھر تو ٹوٹے خمار اپنا

نہ شیفتہ ہوں صنم کدہ کا، نہ ہوں پرستارِ خاکِ کعبہ
ملی ازل میں تھی مے اچھوتی، جدا ہے سب سے شعار اپنا

جسد ہیں بے روح اس جہاں میں، ہنر سے عاری ہیں ترمذی ہم
نہ بو ہے باغِ سلف کی باقی، نہ ہے گلوں میں شمار اپنا

یادِ ایّام

از مسٹر سید غلام پنجتن بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی

قیس میں مجنونیت ہو یا نہو، لیلیٰ نے اس کو دنیا کا رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، نجد اُس کی مجنونیت کا جولانگاہ رہا ہو یا نہ رہا ہو، مگر دنیائے عشق میں مجنوں کی دیوانگی اور لیلیٰ کے ناقہ نے ایک نہ ٹٹنے والی صورت اختیار کرلی ہے۔ لیلیٰ کی شہرت نجد سے نکلکر چار دانگِ عالم میں پھیل گئی اور مقام و زمانہ سے آزاد ہوکر قیس کی امیدوں کی دنیا کے مرادف ہو گئی۔ دنیا والوں کو ماننا ہی پڑا کہ قیس دیوانۂ لیلیٰ ہے، اور نجد کا ہر بگولہ اسکی آنکھوں میں ایک محمل نظر آتا ہے؛ محمل بھی کیسا جسمیں اُس کی امیدوں کی دنیا پنہاں ہے۔ قیس و لیلیٰ کے انفرادی جذبات کچھ ایسے پروان چڑھے کہ حجاز کے رہنے والے جہاں جہاں گئے مجنونیت کے جذبات نے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا، اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں اُنھوں نے اپنا ایک نجد جُدا بنایا، اور اُس نجد میں ایک لیلیٰ تلاش کرلی؛ چنانچہ پیارے منظر! ہم سید احمد خانیوں کا نجد علیگڈھ ہوا، اور جو قومیت سر سیّد وہاں پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ہماری لیلیٰ ہوکر رہ گئی، پھر کیونکر ممکن تھا کہ نجدیوں کو نجد کی یاد تازہ کرنے"۔" آواز بیقرار نہ کردے۔ ہماری گھٹی میں یہ مجنونیت اور علیگڈھ سے عشق نہ ہوتا تو تمھارے جواب میں یہ شعر کافی تھا ؎

کعبہ میں آگئے صنم، بُتکدہ بن گیا حرم ‏ ‏ ‏ قبلہ ہی جب نہیں رہا، رُخ ہو کدھر نماز کا

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب کاشی میں اولڈ بوائے نے جنم لیا تو علیگڈھ سے ہدایت [illegible] اذاں دینے کی رسم ادا کی گئی۔ اور پہلی آواز جس نے بقول سیّد جالب [illegible] تو زائیدہ [illegible] خیر مقدم کیا وہ اُنھیں عمارتوں میں گونجی؛ جہاں گوش حقیقت نیوش کو آج سر سیّد کی یہ آواز سُنائی دیتی ہوگی کہ .... کیا کرنا تھا اور تم نے کیا کیا؟

حالانکہ یہ پرچہ علیگڈھ کے کھنڈرے شوکت کا بچہ تھا؛ جس کو دنیا آج مولانا شوکت کے نام سے
یاد کرتی ہے؛ لیکن کون سے ہاتھ تھے جو خوشی خوشی اس کو آغوش میں لینے کے لئے نہ پھیلے ہوں،
ہم خود اس زمانہ میں طالب علم تھے، اور آپ بیتی نہیں بلکہ کالج بیتی کہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک
اور مہینہ میں ایک دن ایسا ہوتا تھا جب ہمارے اور ہمارے ساتھیوں کے کان بیتابی کے ساتھ پوشین
کے نعل دار جوتے کی آہٹ پر لگے رہتے تھے۔ پہلا دن تو کامریڈ کی آمد کا ہوتا تھا، اور دوسرا دن
اولڈ بوائے کی آمد کا جس کے زیب سرورق ہماری لیلیٰ کا محمل (اسٹریچی ہال) ہوتا تھا۔ تم کو تو شوکت
(توبہ توبہ مولانا شوکت) اس بچے کی نرس بنا کرلے گئے تھے۔ تمہیں خوب یاد ہوگا کہ اولڈ بوائے کے
نکلنے میں ذرا دیر ہوئی کہ تمہارے دفتر میں اشتیاق سے بھری ہوئی تحریریں وصول ہونے لگیں؛
کس نیت سے علیگڈھ والے، چاہے لندن میں ہوں یا برلن میں، نئی دنیا میں ہوں یا گرمی مہر کی
ہلالی دنیا میں، اس کو شروع سے آخر تک پڑھتے تھے، اور اپنی یا اپنے کسی عزیز دوست کی زندگی
کے افسانے پڑھ کر اپنے بچپن کے زمانے اور طالب علمی کے دور یاد کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ کی ایک جھلک
دیکھ کر چند لمحوں کے لئے تو دل میں یہ آرزو ضرور پیدا ہو جاتی تھی کہ سینگ کٹا کر پھر بچھڑوں میں مل جائیں؛
وہ صحبتیں اب خواب ہو گئیں! وہ زمانہ بھی کیا تھا جب ہمارے سینے محبت سے معمور اور کدورت سے
خالی تھے۔ ہماری لڑائیاں عارضی ہوتی تھیں، اور ملاپ کی بنیاد مستحکم تھی۔ ہمارے قضیئے کالج کی چار
دیواری میں محصور، غیر تو غیر کسی دوست کی شکایت اپنے تک لیجانا بھی ہم گناہ سمجھتے تھے۔ طلبہ طلبہ
تھے، اور استاد استاد؛ اِدھر سے شفقت اور اُدھر سے سعادت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہماری شرارتیں طفلانہ
ہوتی تھیں، اور پھبتیاں مخلصانہ! . یہ وہ علیگڈھ لائف تھی جو ہم نے بچپن میں دیکھی، اور جب کالج
میں آئے تو اس کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس زندگی کی یاد تازہ کرنا اور قدیم روایات کا قائم رکھنا،
اور موجودہ طلبہ کو قدیم طلبہ سے ملانا، اولڈ بوائے کا مقصد اولیں تھا اور یہی مقصد اب بھی قائم رہنا چاہیے
دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے؛ جہاں تک آپ کے رسالہ کا تعلق ہے سب ہی پیر نابالغ اور پرانے گولنداز بنے رہیں
جو بات ہو پرانی زندگی کی یاد تازہ کرنیوالی، بوڑھوں کو بچہ بنانیوالی ہو۔ یہ البتہ ہونا چاہیئے کہ اگر ہمارے عہد سے
کوئی کل نکل جائے تو کم سے کم تمام پروفیسر نہیں تو صرف پولیٹکل اکانمی کے پڑھانیوالے دنیا بھر میں ہم سے مل جائیں اور....

اُولڈ بُوائز

۱۔ اپنی قدیم درسگاہ کی محبّت جو نواب نذیر جنگ بہادر کے قلب میں ہمیشہ موجزن رہتی ہے اسی کا تقاضا تھا کہ اولڈ بوائے کے احیا، و اجرائے کام کو اپنے ہاتھ میں لیکر ہر قسم کی معاونت کے لئے اس امید پر تیار ہو گئے کہ دوسرے برادران کالج و یونیورسٹی بھی علی قدر مراتب اپنی توجہ اور بر وقت امداد سے کام لیتے رہیں گے۔ پچھلے دو دوروں کی ابتدائی بہ نسبت دور ثالث کے آغاز میں اولڈ بوائز بفضلہ زیادہ گرم جوشی سے کام کر رہے ہیں، اور مدیر رسالہ کی قلمی و رقمی مدد پہنچانے کے لئے حتی الوسع ساعی ہیں۔ نواب صاحب کے دوستوں کے لئے یہ اطلاع مسرت خیز ہوگی کہ اعلیحضرت حضور پُرنور نے شہزادگان بلند اقبال کا اتالیق مقرر فرما کر اپنے ایک وفاکیش رکن حکومت کو سرفرازی کا موقع عطا فرمایا ہے۔

۲۔ رسالہ کے اجرا کی تجویز بروئے عمل آئی تو سب سے زیادہ دشوار کام اُولڈ بوائز کی ایک طولانی فہرست کا تھا۔ یہ کام اگرچہ اب بھی جاری ہے، لیکن جن اولڈ بوائز نے ہمیں ابتدا میں مدد دی اُن میں ہم مسٹر محمد عثمان، اور مسٹر مہدی حسن زبیری کے ناموں کو سب سے آگے پاتے ہیں۔ اِن کے بعد ہی مسٹر رشید احمد کا نام آتا ہے۔ مسٹر سید محمد اعظم، اور مسٹر سجّاد مرزا نے جو فہرستیں عنایت فرمائی ہیں اُن سے ہماری منزل آسان ہو گئی۔ یہی حال مسٹر نظیر حسین فاروقی، مسٹر محمّد احمد، مسٹر عبد الرزاق اور مسٹر سید محمد تقی کا ہے۔ اول الذکر تو دورہ کی حالت میں بھی اُولڈ بوائے کو نہ بھولے۔ دوسرے مقامی اولڈ بوائز میں مسٹر امجد علی اور مسٹر ابو الحسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہمارے لئے مفصّلات کے برادران میں سے مسٹر عارف الدین (نلگنڈہ) مسٹر حسن احمد (سنگاریڈی) مسٹر عبد الغنی (ہنگولی) مسٹر محمد بہادر (پربھنی) مسٹر افتخار علیخاں (ثریا پیٹھ) مسٹر رشید احمد (اودگیر) مسٹر حامد علیخاں (چنچولی) مسٹر محمد جعفر و مسٹر اکبر عالم (گلبرگہ) مسٹر حافظ علی (بیدر) مسٹر نواب احمد (منبر) اور مسٹر محمد کرم (بیڑ) کے نام لینا ضروری ہیں۔

مسٹر خواجہ یوسف الدین (میدک) نے قلمی معاونت کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر،
مسٹر سید محمد مہدی اور مسٹر اظہر حسن نے اجرائی رسالہ سے متعلق ہماری جس قدر مدد فرمائی ہے۔
ہمارا دل اُن کی شکر گزاری سے لبریز ہے۔ آخر الذکر نے جو کچھ کیا اپنے کالج کی محبت سے تھا،
اور اوّل الذکر دو صاحبان کی توجہ کو ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی ذاتی بلند خیالی ہے۔ آخر
میں ہم اپنے برادر محترم میجر سعید محمد خاں کے منت پذیر ہیں، کہ اس سعی میں حسب وعدہ ہمارے
شریکِ حال ہو گئے، اور نہ صرف رجسٹر خریداران سابق مہیا فرما کر ہمیں ممنون فرمایا بلکہ اس کام میں
ہر قسم کی مدد کرنے کی بھی امید دلائی ہے۔

۳۔ اولڈ بوائے کی ایک غرض جہاں فرزندانِ کالج کو اُن کی مادرِ علمی سے قریب تر کرنا
ہے، وہیں ایک دوسری غرض یہ بھی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حالات سے کماحقہٗ آگاہ
رہ کر، باہمی معاونت کے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اس غرض کی تکمیل کی خاطر ہماری رائے
یہ ہے کہ قدیم ڈائرکٹری سے جدا ایک ایسی ڈائرکٹری تیار کیجائے جس سے کسی شخص کی زندگی پر
تھوڑی بہت روشنی پڑ سکے۔ ہمارے اس خیال کی تائید میں مسٹر قاسم حسن (ہنگولی) اور مسٹر
شمس الحسن (فتح آباد) نے صدا بلند کی ہے۔ اپنی پیدایش سے لیکر اس وقت تک کے حالات
اگر اولڈ بوائز ہمارے پاس روانہ فرمادیں گے تو ہم کوشش کرینگے کہ اُن کو کتابی صورت میں شائع کردیا
جائے۔ رفتہ رفتہ آئندہ اشاعتوں میں حالات کا اضافہ ہوتا رہیگا۔

۴۔ اولڈ بوائز کے عنوان کے تحت اولڈ بوائز اور اُن کے متعلقین سے متعلق جس قدر خبریں
ہمیں وصول ہوتی رہیں گی ہم اُن کو درج رسالہ کرتے رہیں گے۔ انسان کی زندگی کے واقعات اگر
بروقت کسی جگہ قلمبند ہوتے رہیں تو وقت پر بڑا کام دیجاتے ہیں۔ بس ہم اپنے بھائیوں سے
درخواست کرتے ہیں کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی مدیر رسالہ کے پاس روانہ فرمادیا کریں۔

۵۔ ماہ گزشتہ میں ہز ایکسلنسی لارڈ ارون وائسرائے ہند اپنے سفر میسور و جنوبی ہند سے
واپس جانے لگے تو راہ میں ابسٹا ملاحظہ فرمانیکا قصد بھی ظاہر فرمایا۔ لاٹ صاحب موصوف کی پذیرائی
کی غرض سے سرکار آصفیہ کے جو عہدہ دار مقرر کئے گئے تھے اُن سب سے ایک نواب ضیا نواز جنگ بہادر

اول تعلقدار اورنگ آباد بھی تھے۔ اس موقع پر انتظام کی خوبی کے لئے وہ ضرور قابل مبارکباد ہیں۔ منجملہ دوسرے حضرات کے جو اس موقع پر موجود تھے مسٹر جمیل احمد (انجنیر) بھی ہیں؛ جنہوں نے انتظامی معاملات میں کالج کے خصوصیات کو اب تک قائم رکھا ہے۔

۶۔ مسٹر الطاف حسین (اٹاوہ) کے احباب کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ انھوں نے دمہ جیسے تکلیف دہ مرض سے صحت حاصل کرلی ہے۔ بغرض معالجہ اٹاوہ سے حیدرآباد آکر انھوں نے کیپٹن وانکھرے سے رجوع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تھوڑی سی توجہ سے ہمارے ایک بھائی کو اس موذی بیماری سے نجات مل گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مدیر رسالہ اور مسٹر غلام پنجتن کے لئے بھی ایک مدت ہوئی جب کامیاب کوشش کی تھی۔

۷۔ مسٹر سید محمد ضامن کنتوری جو ہمیشہ اپنے کلام سے احباب کے مشام جاں کو معطر فرماتے رہتے ہیں، پچپن سال کے قریب آنے پر ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو ایک بار اور بیٹے کے باپ بنے ہیں۔ اُن کے بہت سے نزدیک و دور کے احباب اُن کو مبارکباد کے پیام اور مٹھائی کے تقاضے بھیجیں گے، اور ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی شیریں کلامی سے اُن تقاضوں کی ضرور پذیرائی فرمائیں گے۔ بچہ کا نام علی ضامن ہے۔

۸۔ سنتے ہیں کہ اس مرتبہ دوسرے برادران اسلام کے ساتھ بہت سے اولڈ بوائز بھی حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ کو تشریف لے گئے تھے۔ اخبارات میں جو نام ہماری نظر سے گزرے ہیں، سر رشید عبدالرؤف، نواب مختار یار جنگ بہادر، اور خانصاحب محمد ثمنی، کا شمار بھی انہیں میں سے ہے۔ اللہ میاں کو ڈھونڈھنے کی غرض سے عربستان کے سفر کے لئے مولوی مجیب احمد تمنائی اور مسٹر ہارون خاں شروانی بھی تیار ہو گئے تھے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے کام کو پورا کرکے بخیر خوبی واپس آگئے ہیں۔ یہ دونوں حضرات صاحب قلم ہیں۔ اگر اپنی سرگزشت روانہ کرنیکی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو ہم شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کردیں گے۔ تبرکات کے لئے ہمارا تقاضہ پھر بھی باقی رہیگا۔ مہربانی فرماکر مسٹر لطف احمد تفصیل کے ساتھ ہمیں بتائیں کہ مناہیں اصلاح سازی کی تلاش میں ہمارے حاجیوں پر کیا گزری۔

۹۔ اپنی عمارات کے لحاظ سے ہندشمالی میں اکبرآباد کو ممتاز درجہ حاصل ہے، اور ہم آگرہ کو اس وجہ سے بھی پسند کرتے ہیں کہ وہاں کے شرفا نے ورزش اور اپنی صحت قائم رکھنے کے بہت سے مشاغل کو اب تک جاری رکھا ہے، آگرہ کی عمارتوں میں حال ہی میں ایک مناسب اضافہ شہر کی کوتوالی کی تعمیر سے ہوگیا ہے۔ عہدحاضرہ کی یہ عمارت اگرچہ شاہانِ مغلیہ جیسی عالیشان تعمیر تو نہیں، لیکن ہمارے لئے اِس سبب سے قابلِ یادگار ہے کہ خان صاحب امتیاز محمد خاں کے عہد کوتوالی میں تیار ہوئی ہے۔ باوجودیکہ خان صاحب اپنے ہاتھ کی کئی انگلیاں شہید کرا چکے ہیں مگر افغانیت اب بھی باقی ہے، اور مونچھوں پر کاسمیٹک کا استعمال تو اس وقت بھی جاری تھا جب خون میں تر ہسپتال میں پڑے تھے۔ نینی تال میں اُن سے ملکر وہاں کے تمام اولڈ بوائز کو بڑی مسرت حاصل ہوئی، اور مدت کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم اپنے کالج کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے ہیں، مسٹر حیدری، مسٹر شمس الدین اور مسٹر ساجد علیخاں (بھولیا والے) گواہی دیں!

۱۰۔ نواب میر موسیٰ خاں صاحب کے بہت سے احباب کو یہ معلوم کرکے ملال ہوگا کہ انکی والدہ صاحبہ نے حیدرآباد میں وفات پائی۔ خدا مرحومہ کو جوار رحمت عطا فرمائے۔ اور پس ماندوں کو صبر دے۔ اس غم میں ہم اپنے بھائی کے شریک ہیں۔

۱۱۔ مولوی محمد عبدالرزاق حیدرآباد سیولین نے حال ہی میں اپنی بچی کی چھٹی سالگرہ کی تقریب میں بزم مشاعرہ ترتیب دی تھی، اس موقعہ پر حیدرآباد کے تقریباً تمام خوش فکر شعرا جمع تھے۔ برادرانِ کالج بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے حضرتِ جوش، حضرت اختر، جناب اصغر اور خود صاحبِ مشاعرہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو لطف اندوز فرمایا۔ سامعین میں مسٹر لیاقت اللہ، مسٹر مختار علیخاں، مسٹر رشید احمد، اور مسٹر عبدالستار قابل ذکر ہیں، کہ پیٹ بھر کر کلام سُنا، اور سیر ہوکر کھانا کھایا! مگر بتیس شیرمالیں ہضم کرنے والا ان میں سے ایک نہ تھا۔ اس موقعہ پر جو کلام پڑھا گیا ہم آئندہ کبھی درج کریں گے؛ بشرطیکہ مل گیا۔

۱۲۔ مسٹر سید غلام پنجتن کو گزشتہ مہینہ میں خدا نے دو خوشیاں دیں؛ ایک تو یہ کہ پانچویں اولاد کے باپ بنے، اور دوسرے یہ کہ اُن کے چھوٹے بھائی مسٹر سرور حسن ہندوستان کی تعلیم سے

خوشی میں آغا حیدر صاحب اولڈ بوائے کے صفحات پر اپنی روشنائی کے چند قطرے ٹپکا دیے گئے۔

۱۸۔ مولانا شوکت علی صاحب کے فرزند ثانی مسٹر شاہد علی نے ایک مدت کی علالت کے بعد ۸ ارستمبر کو دہلی میں وفات پائی۔ اس موقعہ پر مرحوم کے والد ماجد کے سوا اور بہت سے عزیزانِ وطن دہلی میں موجود تھے، مگر ان کے چچا مولانا محمد علی صاحب شملہ میں تشریف رکھتے تھے، اور بڑے بھائی نے ذریعۂ تار ہدایت فرمائی تھی کہ اتحادی کانفرنس کے خاتمہ تک وہ واپس نہ آئیں۔ ہمیں اس غم میں اپنے برادران سے دلی ہمدردی ہے، اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند کریم مرحوم شاہد کو جوار صالحین عطا فرمائے۔

۱۹۔ اولڈ بوائز ڈائرکٹری کے لیے اولڈ بوائز نے مہربانی فرما کر مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب تحریر فرمادے تو اس کام میں آسانی ہوگی (۱) نام مع ولدیت وسکونت مقام و تاریخ پیدایش، (۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی؟ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی؟ تعلیمی زمانہ کے خصوصیات و امتیازات (اگر کچھ ہوں) (۳) علیگڈھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے، اور ان میں کیسا نام پیدا کیا؟ (۴) علیگڈھ میں عملی طور پر کن کن کاموں میں شرکت کا موقعہ ملا مع اسکے نتیجہ کے، (۵) علیگڈھ سے باہر جاکر کس قسم کی زندگی کو اختیار کیا؟ اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ (۶) ملک میں یا بیرونِ ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر (۷) ملک کی علمی، ادبی، یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ، (۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد مع فرزندوں کے نام۔

مطبوعۂ عماد پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن

فارغ ہوکر عازم انگلستان ہوئے۔ مسٹر پنجتن اگر رسالہ کے "یاد ایام" کے لئے تیار ہو کر لکھیں، تو انکی جانب سے اِن مواقع کی بڑی دعوت ہوگی۔

۱۳۔ مسٹر عنایت اللہ کی ادبی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں ہے، اور اولڈ بوائز میں سے نوبت ہی کم ایسے ہوں گے جو اُن کے علمی مشاغل سے واقفیت نہ رکھتے ہوں۔ ان سب کے لئے یہ امر موجب امتنان ہے کہ حضور پرنور نے نظامت دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لئے مزید ایک سال کی توسیع منظور فرمائی ہے۔ برادر محترم ہماری مبارکباد قبول فرماویں۔ اور اولڈ بوائے کے لئے جس مضمون کا وعدہ کیا ہے، جلد روانہ فرماویں۔

۱۴۔ سلام دین (معاف فرمائیے آنریبل جسٹس سلام الدین) اور لارڈ حیات کے بہت سے بے تکلف دوستوں کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ حال ہی میں جو تغیرات حکومتِ بھوپال میں رونما ہوئے ہیں، اُن میں ہمارے ان دونوں بھائیوں نے ترقی کا حصہ پایا ہے؛ یعنی مسٹر سلام نواب مولوی لیاقت علی صاحب کی جگہ ریاست کی عدالت عالیہ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے ہیں، اور مسٹر حیات (یعنی مولانا محمد علی کی سکرٹری مسٹر حسن محمد حیات) اس ریاست کے جوڈیشل سکرٹری۔ دونوں کو ہم اس وقت مبارکباد دیں گے جب وہ بھوندو کو پکڑ کر اولڈ بوائے کے لئے ایک اچھا سا مضمون لکھا منگائیں۔

۱۵۔ برادر محترم خواجہ غلام السیطین صاحب نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ مرحوم خواجہ غلام الثقلین کی سیرت سے متعلق ایک طویل مضمون ہمیں اولڈ بوائے کے لئے مرحمت فرمائیں گے: کیا اچھا ہو کہ اب وعدہ پورا کیا جائے، ہم اس تقاضہ میں عزیزی سیدین کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

۱۶۔ ہم پریس کو جا رہے تھے کہ ہمیں لفٹنٹ آغا علی حسن کے یہاں فرزند نرینہ تولد ہونیکی اطلاع وصول ہوئی۔ خدا بچہ کی عمر دراز کرے۔ بچّے کے بابا بھی حال ہی میں سب لفٹنٹ سے لفٹنٹ ہو چکے ہیں۔

۱۷۔ مسٹر آغا حیدر حسن خدا خدا کرکے کوتوالی سے تعلیمات میں منتقل ہوئے تھے۔ انکا پہلا تقرر جاگیر دار کالج میں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم کے بجائے نظام کالج کی اُردو پروفیسری کے لئے ہمارے آغا کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اِس

فہرست کتاب منتظر الکرام

قیمت خاص — عہ مجلد
قیمت عام — عہ

سید منتظر علی
۴۰۱۲ سلطان پورہ حیدرآباد دکن

صدر الصدور

چیف کمانڈر

معتمدین

ارکان عدالت العالیہ

نظماء

صوبہ داران

تعلقداران

فضلا و شعرا

اہل فن

یہ سرورق!
بالکل عارضی ہے

اور

قدیم روش کے خلاف کوئی بدعت نہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ ڈائی جناب مولانا شوکت علی صاحب کے پاس اُن کے مستقر پر ہے، اور اُن کو تھوڑے عرصہ سے ناگزیر ذاتی حالات کے مدِ نظر مستقر سے دور رہنا پڑا ہے۔ جیسے ہی مولانا کو اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب ہوا ہم اُن سے ڈائی طلب کر لیں گے اور پھر سرورق اپنی اصلی حالت پر آجائیگا۔ ناظرین چندے تامل فرمائیں۔

منیجر — منظور علی   **مینازکیش**